

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے، خیر و برکت والی ہے

# تفسیر ابن جریر اردو

— تالیف —

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظہور الباق اعظم

ناشر

دیوبند (یوپی)  
بیت الحکمت

اردو زبان میں حضرت کی عظیم المرتبت کتاب صحیح بخاری کی کامل و مکمل شرح مؤسسہ

# انوار الباری شرح ابو صحیح البخاری

مع مکمل عربی متن و اردو ترجمہ

مرتبہ مولانا سید احمد رضا صاحب (فاضل دیوبند) علیہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب محدث کثیر قدس اللہ سنہ العزیز  
۱۰۰۰ سال بعد افتاب نبوت کی کرنیں، احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیا پاشیاں نئے انداز میں

دین اسلام کی پوری عمارت و مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے قرآن مجید اور حدیث صحیحہ۔ اور جس طرح پر دینی یا دنیوی قانون کے لئے توضیحات و تشریحات کی ضرورت ہے قرآن مجید اور احادیث مقدمہ کی شرح و تفسیر کی بدولت ضرورت تھی: عربی، فارسی، اردو اور دنیا کی دوسری زبانوں میں قرآن مجید کی سیکڑوں تفاسیر و تراجم لکھے گئے، اسی طرح کتب حدیث کی بھی عربی و فارسی وغیرہ زبانوں میں صد ہا شرح تصنیف ہوئیں، مگر اردو کا دامن حدیث کی کما حقہ اس خدمت سے خالی تھا۔ اسلام کا مکمل قانون دینی و دنیاوی زندگی میں قرآن مجید کی جہاں تاب روشنی کے بعد حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تفسیر پر جس میں مسائل فقہیہ کے علاوہ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، انسان کی دینی و دنیوی زندگی کے تمام مسائل غرض پورے اسلامی معاشرے کی مکمل صحیح ترین تصویر سامنے آجاتی ہے۔ پھر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند پایہ احادیث کو امام بخاری نے جس حسن و خوبی اور صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب فرمایا ہے اس کی نظیر اولیٰ آخر میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم نے خالص دینی نقطہ نظر سے کتاب بخاری کی اردو ترجمہ کا نیا باب کھولا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان تشریحات میں آپ کو حدیث رسول کی اصل عظمت محسوس ہوگی، دور حاضر کے تمام مسائل اور ابھینے اس طرح حل نظر آئیں گی کہ حدیث زندگی کے تمام شعبوں میں کار فرما ہو۔ فقہیات کا تمام مجموعہ احادیث رسول کا ایک عطر محسوس ہوگا۔ فرق باطلہ کیلئے یہ مجموعہ ایک ضائقہ محرقہ ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ایک نسخہ شفاء :- مصائب مشکلات کے وقت تمام علماء اسلام نے بخاری شریف پڑھنے کا معمول رکھا ہے، اور یوں ہی پڑھتے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ہم کلائی کی برکت حاصل ہو، ایسے تو مبارک ارشادات انوار سے موجود ہوتے ہیں کہ کبھی تو خیر و برکت کا عظیم مہر ہے، دین دنیا کی سب بڑی عزت سعادت و قابل فخر دولت

## چند دیگر خصوصیات

- ۱ بخاری شریف کا پورا متن اعراب کیساتھ عربی خط میں، اور اردو ترجمہ و تشریحات عمدہ نستعلیق خط میں ہوں گی۔
- ۲ بخاری شریف کی قدیم شرح فتح الباری، عمدۃ القاری، ارشاد الساری، تیسیر القاری وغیرہ سے اہم مباحث و ضاحت کے ساتھ درج ہوں گے
- ۳ اپنے اکابر حضرت گنگوہی، شیخ الہند، حضرت مولانا مدنی کی تقاریر دُرس ترمذی و بخاری کے افادات علیہ السلام
- ۴ محدث یگانہ علامہ عصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب سیرت کی مطبوعہ تقاریر دُرس ترمذی و بخاری و ابوداؤد، لفظیات عالیہ اور غیر مطبوعہ تقاریر دُرس بخاری شریف کے وہ مضامین عالیہ بھی درج کئے گئے ہیں جو مرتب مہسون نے بڑا زیادتیام جامعہ ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر کئی سال تک لکھنے کئے تھے
- ۵ اور علامہ عثمانی کی فتح الملہم شرح مسلم کی گرانقدر علمی تحقیقات اور حدیثی تشریحات کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے
- ۶ مختلف فقہی مسائل پر حنفیہ کی طرف سے دلائل و جوابات کا قابل قدر ذخیرہ پیش ہوگا جس میں حضرت شاہ صاحب کی حاشی آثار السنن سننی الامتات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

حضرت اقدس مجددِ صحت اور دوسرے اکابر امت کے افاضات بھی موقع موقع درج ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

## لاکھ عمل اور ضروری باتیں

- ۱) پوری کتاب کے تقریباً آٹھ ہزار صفحات ہوں گے، خریداروں کی سہولت کے خیال سے بلا قسط شائع کی جاتی ہے
- ۲) یہ مجموعہ تقریباً چالیس حصوں میں شائع ہوگا جس کے پہلے دو حصے ۴۰۰ صفحات کے بطور مقدمہ شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں ۱۲ صدی کے مات سو محدثین کے گراں قدر علمی حالات و حدیثی خدمات مذکور ہیں۔ تیسرے حصے سے بخاری شریف کی بے نظیر مسوط و مکمل شرح اردو میں صحابی پروردگار کے تحت اشاعت پذیر ہے، جو علماء، طلباء، جدید تعلیم یافتہ اور عام مسلمانوں کے لئے نہایت مفید ہے۔
- ۳) (ہدایہ) مقدمہ کی ہر دو جلد آٹھ روپے آٹھ آنے۔ باقی ہر حصہ تین روپے آٹھ آنے۔ لیکن ممبران ہندو پاک کے لئے جو ایک روپیہ بیس میری آٹھویں حصے کی اشاعت سے قبل جمع کر دیں گے، ہر حصہ غیر مجلد ۲۰ روپے دو سو صفحات کا ڈھائی روپے میں ہوگا (علاوہ محصول ٹاک) جو حضرات مکمل کتاب غیر مجلد مع محصول ٹاک درج پڑی کے لئے ڈیڑھ سو روپے، مجلد کے لئے دو سو روپے جمع کریں گے۔ وہ اس عظیم حدیثی خدمت کے معاونین شمار ہوں گے۔

مکتبہ ناشر العالم، بخارہ روڈ، بجنور (دیوبند)

اردو پبلشرز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مَبَآئِنًا

تفسیر

ابن جریر

اردو

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ قرآن پاک

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

جز 4

مکتبہ عثمانیہ 2280 مینا بازار

پورالغہی بخش کالونی کراچی 5

شائع کردہ

بیت الحکمت دیوبند (دیوبند)

قیمت دو روپیہ

# احوال واقعی

۲۹۷۵۱۴  
۱۳۳۱

۱۳۳۹۸

خدا کے کائنات کا کس زبان سے شکر ادا ہو کہ آج قارئین کی خدمت میں "ابن جریر" کے اردو ترجمہ کا چوتھا جز پیش کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ ہم نے اس اہم خدمت کا منصوبہ اسی منعم حقیقی کے فضل و کرم کے یقین پر بنایا تھا اور اسی کی رحمت ہے کہ آج ہمارے قدم اس منزل پر ہیں!

مفسر ابن جریر ایک اہم اور طویل تفسیر ہے جس پر تمام تفاسیر کی بنیاد قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی طول و طویل تفسیر کو اردو میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ پھر ہمارے پیش نظر صرف اردو ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ احادیث اور اس کے آخذ کی چھان بین، جا بجا مختصر مگر جامع نوٹ، ادبی محاورات و لغات کی تحقیق بھی ہے۔ اس لیے ان مراحل میں جو محنت و کاوش اور عرق ریزی کرنا پڑتی ہے اس کا اظہار بھی دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارہ کا معینہ مدت پر آپ کے ہاتھوں میں پہنچا دشوار ہو جاتا ہے اگر وقت پر ہم ان مراحل سے گزرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو پھر بھی کوئی نہ کوئی وجہ ایسی پیش آجاتی ہے۔ مثلاً کتابت کا مرحلہ، کتابوں کی نایابی، کاغذ کی فراہمی وغیرہ جس کی بنا پر ہماری کوششوں کا قافلہ اپنی منزل پر دیر سے پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے کہ ناظرین کرام ہمیں لکھتے رہتے ہیں کہ ہر قسط میں ایک پارہ مکمل شائع کرنے کا وعدہ تھا۔ مگر اب تک کسی قسط میں مکمل ایک پارہ نہ آسکا، اس سلسلے میں ہم ابن جریر کی تیسری قسط میں اعلان کر چکے ہیں کہ ابن جریر ایک طویل تفسیر ہے۔ خصوصاً سورہ بقرہ کی تفسیر بعض خصوصیات کی بنا پر بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس لیے شروع کی تفسیر مکمل ایک پارہ کی ہمارے مقررہ تقریباً سو صفحات (جن کی ہم نے پروگرام کے اعلان و اشاعت کے وقت وضاحت کر دی تھی) میں آنا ناممکن ہے۔ پھر بھی کوشش یہی رہتی ہے کہ ہر جز میں زیادہ سے زیادہ تفسیر آجائے۔ انشاء اللہ پانچ چھ پاروں کی تفسیر کے بعد آپ کو مکمل ایک پارہ ہر قسط میں روانہ کیا جاسکے گا۔ ابتدائی پروگرام میں بجائے جز کے پارہ کا ذکر ہے۔ اس سے مراد وہی ۹ صفحات کا جز تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انھیں مقررہ صفحات میں پورا پاؤں آجائے جس کی کوشش بہر حال ہے۔ لیکن سب سے درست ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ جلد بازی سے کام لے کر ہمارے اس عظیم اور خالصتاً لوجہ اللہ مقصد کو ناکام نہ کریں۔ بعض خریدار وی، پی و ایس کر کے ادارہ کی سخت حوصلہ شکنی کرتے ہیں جس کا ادارہ کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ہم آپ کو بتائیں گے کہ اس کام میں کوئی مالی نفع حاصل نہیں ہے۔ اس پر یہ نقصان کہیں ہماری ہمتیں پست نہ کر دے اور اس طرح قرآن حکیم کی خدمت کا یہ مقدس جذبہ فنا نہ ہو جائے۔ خود بانہ گذارش ہے کہ جو حضرات خریداری سے دستبردار ہونا چاہیں وہ براہ کرم پارہ کی ترسیل سے پہلے ہی ایک کارڈ لکھ کر مطلع کریں تاکہ ان کی خدمت میں پارہ ارسال نہ کیا جائے۔ نیز خالص دینی جذبہ رکھنے والے احباب سے پرزور اپیل ہے کہ وہ اس مقدس دینی خدمت میں ہمارے ساتھ تعاون و اشتراک فرمائیں۔ قرآن حکیم کی اشاعت و تفسیر کی خدمت میں تعاون انشاء اللہ العزیز آپ کے لیے اجر عظیم کا باعث ہوگا۔

نیاز مند منیجر

## فہرست مضامین تفسیر ابن جریر خبر چہارم

نمبر صفحہ	عنوان	نمبر صفحہ	عنوان	نمبر صفحہ
۲۰	جب عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے	۱۶	۵	۱
۲۱	کشمکش کا عالم	۱۷	۵	۲
۲۵	حلت و حرمت اللہ کے حکم پر موقوف ہے	۱۸	۸	۳
۲۶	سوچنے کا غلط انداز	۱۹	۱۲	۴
۲۷	یہودیوں کی مثال	۲۰	۱۶	۵
۲۸	مسلمانوں سے خطاب	۲۱	۱۸	۶
۵۱	شوخی چشمی	۲۲	۱۹	۷
۵۲	طاعت کیا ہے؟	۲۳	۲۱	۸
۵۷	قصص اور اس سے متعلق احکام	۲۴	۲۴	۹
۵۹	مصالحات کے بعد	۲۵	۲۶	۱۰
۶۲	وصیت کے احکام	۲۶	۲۷	۱۱
۶۵	روزے کے احکام	۲۷	۲۹	۱۲
۷۰	بابرکت مہینہ، اس کے فضائل اور خصائص	۲۸	۳۲	۱۳
۷۶	میں اپنے بندوں کے قریب ہی ہوں	۲۹	۳۵	۱۴
۷۸	روزہ کے مسائل	۳۰	۳۷	۱۵

## پاکستانی خریدار

پارہ کی قیمت معہ ڈاک خرچ و فیس ممبری جو تین روپیہ ہوتی ہے۔ سواروپہ پارہ کی قیمت، بارہ آنے ڈاک خرچ اور ایک روپیہ فیس ممبری) حضرت مولانا محمد صاحب انوری لائپوری مکان نمبر ۲۲۴ سنت پورہ مین بازار لائل پور (مغربی پاکستان) کو بھیج کر ڈاک خانہ کی رسید ہمیں دیو بند روانہ کر دیں۔ پارہ ان کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے گا۔ اب تک چار جز شائع ہو چکے ہیں۔ چاروں جز طلب کرنے والے حضرات ساڑھے سات روپے کا منی آرڈر مولانا موصوف کو روانہ کر دیں۔

منیجر  
بیت الحکمت دیوبند (یو پی)

# مدرسہ و خانقاہ کی رفعتوں سے

## ابن جریر کی پرکامل عہد

جذبات فخر و شکر کے ساتھ، یادگار سلف، فخر روزگار، حضرت الشیخ مولانا فخر الدین صاحب دامت برکاتہم  
مسند آرائے محفل حدیث دارالعلوم دیوبند، و پیشوائے بزم سیاست وین جمعیۃ العلماء ہند کی وہ گرامی قدر رائے پیش  
کی جا رہی ہے جو آپ نے ازراہ ذرہ نوازی ابن جریر اردو پر ظاہر فرمائی، ایک ادنیٰ تمیذ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا  
سند ہوگی کہ قابل فخر استاذ، اس کی حقیر کوششوں کو بنظر احسان دیکھے۔ متعنا اللہ بطول حیاتہ۔ ظہور الباری عظمیٰ

اما بعد!۔ اس وقت احقر کے پیش نظر "تفسیر ابن جریر اردو" کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ ترجمہ مولانا ظہور الباری  
اعظمی فاضل دیوبند کے رشوق قلم کا نتیجہ ہے۔ ماشار اللہ ترجمہ عام فہم سلیس اور با محاورہ ہے۔ اس ترجمہ میں  
ہر آیت کے متعلق اقوال سلف کے ساتھ علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے جو شہادتین محاورات  
عرب کی پیش فرمائی ہیں بالاختصار ان کے سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ نقل احادیث میں اس کا پورا پورا  
لحاظ رکھا گیا ہے کہ اصل احادیث کا کوئی ضروری حصہ نہ جائے۔ اسانید میں صرف منہار سند کے رواۃ  
کے نام ذکر کر دیئے گئے ہیں اور ایک ہی مضمون کی متعدد احادیث میں امام ترمذی کے طریق کا اتباع  
کرتے ہوئے ایک دو حدیث کو پورے ترجمے کے ساتھ پیش کر کے بقیہ روایات کا حوالہ دے دیا گیا  
ہے۔ اور مقصد کے لحاظ سے ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ بہر حال یہ ترجمہ ہر حیثیت سے قابل اعتماد ہے۔ کہیں  
کہیں مترجم کا نوٹ بھی دیکھنے میں آیا۔ میرے خیال میں جہاں ایسا ہوا ہے وہاں ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔  
احقر دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم تمام ترجمہ کی توشیح بخشنے اور ترجمہ کو عوام اور علماء میں مقبول بناوے  
اور مترجم کو اپنے خصوصی انعامات سے نوازے۔ آمین

(حضرت مولانا) فخر الدین احمد غفرلہ

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

## پانچ سیقول

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ عَن قِبَلِهِمُ الَّذِينَ كَانُوا

اب تو یہ بے وقوف لوگ ضرور کہیں ہی گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس

عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ

بات) نے بدل دیا آپ فرمادیجئے کہ سب مشرق اور مغرب اللہ ہی کی ملک میں ہیں جس کو خدا ہی چاہیں (یہ)

يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں۔

کم عقلی کی ایک اور مثال "سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ" اب بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے یعنی لوگوں میں جو جاہل ہیں۔ مراد یہود اور منافقین ہیں۔ انھیں "سُفَهَاءُ" و "سُفَهَاءُ" سے، بمعنی

کم عقل، جاہل) اس لیے کہا گیا کہ اتباع حق کے معاملہ میں انھوں نے کم عقلی اور جہالت کا ثبوت دیا تھا، ہم نے کہا کہ "سُفَهَاءُ" سے مراد یہود اور منافقین دونوں ہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت سے نقل ہے کہ مراد یہود ہیں۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور برادر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول منقول ہے۔ دوسرا قول جو مسددی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے یہ ہے کہ آیت سے مراد منافقین ہیں "مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبَلِهِمُ الَّذِينَ كَانُوا عَلَيْهَا" کس چیز نے ان کو پھیر دیا ان

کے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے "مَا وَلَّاهُمْ" یعنی کس چیز نے انھیں پھیر دیا، یہ "وَلَّاهُ فُلَانٌ كُفْرًا" (فلاں نے اپنی پشت میری طرف پھیر دی) سے ماخوذ ہے۔ "قِبَلَتِهِمْ" میں "قِبَلَةٌ" کے اصل مفہوم میں ہر وہ چیز

آجاتی ہے جو چہرہ کے سامنے ہو، فَخَلَّتْكَ کے وزن پر۔ "فَاقْبَلْتُ فُلَانًا" سے ماخوذ، یعنی میں اور فلاں آمنے سامنے ہو گئے، اس وقت بولتے ہیں جب دونوں کا چہرہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جائے۔ آیت کا مطلب

یہ ہے کہ "عنقریب جب تم یہود کے قبلہ کے بجائے جو اب تک تمہارا بھی قبلہ رہا ہے، میرے حکم کے مطابق اپنی نمازوں میں چہرہ خانہ کعبہ کی طرف کرنے لگو گے تو یہ بے وقوف لوگ تم سے کہیں گے کہ اے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والو!

تمہیں کس چیز نے نماز میں تمہارے اس قبلہ سے پھیر دیا ہے جس پر تم اب تک تھے اور اب کیوں تم سابقہ قبلہ کے بجائے دوسری طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے اس کی خبر دے دی

ہے کہ جب بیت المقدس کے بجائے اللہ کے حکم کے مطابق تمہارا قبلہ خانہ کعبہ کی طرف پھیر دیا جائے گا، جس کا حکم عنقریب ہی نازل ہونے والا ہے، تو یہودی اور منافقین تم پر کس طرح کا اعتراض کریں گے۔ اور پھر اسی آیت میں ان کے اعتراض کا معقول اور مسکت جواب بھی بتا دیا گیا ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد جب بے وقوفوں کا یہ طبقہ آپ پر اعتراض کرے تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدت تک، جس کے متعلق ہم آگے روایات بیان کر رہے ہیں، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اب آپ بجائے بیت المقدس کے خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ اسی کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے کہ جب آپ کا قبلہ بدل دیا جائے گا تو بے وقوف لوگ کیا اعتراض کریں گے۔ اور ان کے اعتراض کا جواب کیا ہونا چاہیے۔ ہجرت کے بعد کتنی مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی؟ اس مدت کی تعیین کے سلسلے میں مفسرین سے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہجرت کے سترھویں مہینے رجب میں قبلہ شام (بیت المقدس) کے بجائے خانہ کعبہ بنا دیا گیا تو رفاعہ بن قیس، قروم بن عمرو، کعب بن اشرف اور نافع بن ابی نافع (یہودی) آئے، یہ نام آپ سے ابن حمید نے نقل کیے ہیں، آپ سے جو روایت ابو کریب نے نقل کی ہے اس میں رافع بن ابی رافع، کعب بن اشرف کے حلیف حجاج بن عمرو، زینح بن ریح حقیق اور کنانہ بن حقیق کے نام بھی لیے ہیں۔ ان سب نے آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اے محمد! آپ کو اس قبلہ سے جس پر اب تک آپ تھے، کس چیز نے پھیر دیا؟ وجہ معلوم ہو جائے تو ہم بھی آپ کی اتباع اور آپ کی تصدیق کریں۔ ان کا مقصد صرف آپ کے دین میں فتنہ ڈالنا تھا۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ برابر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے سترہ مہینے نماز پڑھی آن حضور کی خواہش یہ تھی کہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ کو بنا دیا جائے۔ چنانچہ ایک دن ہم (مسجد نبوی کے علاوہ دوسری مسجد میں) نماز (عصر) پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب جنھوں نے آن حضور کے ساتھ نماز پڑھی تھی اس مسجد سے گزرے جس میں ہم نماز پڑھ رہے تھے اور کہا، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا ہے۔ بیان کیا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کیے ہوئے ہم دو رکعت نماز پڑھ چکے تھے ان کی اطلاع پر خانہ کعبہ کی طرف رخ کر لیا گیا اور باقی دو رکعت اس طرف رخ کر کے پڑھی گئی۔ برابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہجرت کے بعد سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا منقول ہے۔ اس روایت میں ہے کہ جب تحویل قبلہ کے متعلق اہل مسجد کو معلوم ہوا تو وہ رکوع میں تھے۔ تمام نمازی خبر سنتے ہی اسی حالت میں سمت بیت المقدس سے سمت کعبہ کی طرف پھر گئے۔

سبب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف سولہ مہینے تک رخ کر کے نماز پڑھی اور تحویل قبلہ جنگ بدر سے دو مہینے پہلے ہوا۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نو یا دس مہینے آن حضور نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ ایک دن مدینہ میں کھڑے آپ ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ تحویل قبلہ کا حکم ہوا

۱۵ بیت المقدس مدینہ سے شمال کی طرف ہے جب کہ خانہ رجبوں میں ہے۔



اور آپ نے اپنا چہرہ نماز ہی میں خانہ کعبہ کی طرف کر لیا۔ اس پر بے وقوفوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد تیرہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھی۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تین سال تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی اور آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کے بعد سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔

اس میں بھی مفسرین کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں کہ کعبہ کی طرف نماز میں چہرہ کرنے کی فرضیت سے پہلے آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس سبب کی بنا پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس کا آن حضور کو اختیار تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خصوصی حکم نہیں تھا۔ چنانچہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قرآن میں نسخ کے طور پر سب سے پہلے قبلہ کا حکم نازل ہوا تھا، آن حضور صخرہ بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ یہ قبلہ پہلے سے یہودیوں کا چلا آتا تھا۔ آن حضور نے بھی اس طرف چہرہ کر کے نماز اس وجہ سے پڑھی مشروع کی تاکہ یہ لوگ آپ کے قریب آجائیں اور آپ پر ایمان لائیں اور پھر اس کے ذریعہ آپ ان پڑھ اہل عرب کو بھی اسلام کی دعوت دیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی کہ ”اللہ ہی کے لیے ہے مشرق و مغرب، اس لیے جس طرف بھی تم چہرہ کر دو گے وہیں اللہ کو پاؤ گے“ ابو العالیہ رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا تھا کہ نماز آپ جس طرف چاہیں رخ کر کے پڑھیں، آپ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرنا پسند کیا، تاکہ اہل کتاب کو اپنے سے قریب لاسکیں۔ سولہ مہینے تک آپ کا یہی قبلہ رہا، لیکن آپ اس کے بجائے خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے حکم کے لیے چہرہ مبارک بار بار آسمان کی طرف کرتے تھے۔ پھر آپ کو اسی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور فرض نازل ہوا تھا۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، علی بن ابی طلحہ آپ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے بیان کیا کہ جب آن حضور مدینہ جہاں یہودیوں کی بھی آبادی تھی، ہجرت کر کے تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ یہودی اس حکم سے بہت خوش تھے۔ آن حضور نے تقریباً دس مہینے اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھی لیکن آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ (خانہ کعبہ) کو پسند کرتے تھے اور اس کے لیے دعا کرتے تھے اور بار بار نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ ”بے شک ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا، اور قبلہ بدل دیا گیا۔ یہودیوں کو اس سے مشہبہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ جس قبلہ پر وہ اب تک تھے اسے آخر کس چیز نے بدل دیا۔ زیر تفسیر آیت اسی پر نازل ہوئی۔ کچھ اسی طرح کی روایت ابن جریج سے بھی ہے یہودیوں اور منافقوں کا جو اعتراض آیت میں نقل ہوا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں دو مختلف روایتیں ہیں کہ انھوں نے یہ اعتراض کیوں کیا تھا؟۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں نے محض دین اسلام میں فتنہ ڈالنے کے لیے آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تحویل قبلہ کے بعد کہا تھا کہ آپ اپنے سابقہ قبلہ (بیت المقدس) کو پھر اختیار کر لیں تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ کے متبع بن جائیں گے۔ اسی کی حکایت آیت میں ہوئی ہے۔ دوسرا قول وہ ہے جو اوپر علی بن ابی طلحہ کے واسطے سے نقل ہوا۔

تبادہ نے فرمایا کہ تحویل قبلہ کے بعد یہودیوں نے اس حضور کے متعلق کہنا شروع کیا کہ معلوم ہوتا ہے اب انھیں اپنے وطن کی یاد زیادہ آنے لگی ہے۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔ سدی سے روایت ہے کہ اعتراض جو آیت میں نقل ہوا ہے وہ منافقوں نے کیا تھا۔ آپ نے بیان کیا کہ تحویل قبلہ کے بعد اسلام دشمن جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف اعتراضات شروع کر دیئے تھے، منافقین نے یہ اعتراض کیا تھا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک زمانہ تک ایک خاص قبلہ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھی جاتی رہی اور پھر اسے بدل دیا گیا تو آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

”قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“ (آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، وہ جسے چاہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے)۔ اس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو رہا ہے کہ آپ ان معترضین سے کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، یعنی مشرق و مغرب اور ان کے درمیان میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کی ملکیت میں ہے، اللہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور ”صراطِ مستقیم“ (سیدھی راہ) پر چلا تا ہے۔ اس سے مراد ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ لوگوں کے امام و پیشوا تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے رسوا کرتا ہے اور حق کے راستے سے دور کر دیتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! آپ کہہ دیجئے کہ خانہ کعبہ کو سہارا قبلہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے قبلہ ابراہیمی کی طرف ہماری ہدایت کی ہے، اور اے یہودیو، منافقو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والو! تمہیں اللہ نے گمراہ کیا ہے اور نامراد رکھا ہے۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو

وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي

اور تمہارے لیے رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس)

كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِنْ يَنْقَلِبُ عَلَى

وہ تو محض اس کے لیے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ کون تو رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون

عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ط

پیچھے کو ہٹا جاتا ہے اور یہ قبلہ کا بدلنا منحرف لوگوں پر ہوا بڑا ثقیل (ہاں، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِعَ إِيمَانَكُمْ ط إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرُءُوفٌ رَحِيمٌ ○

اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع (اور ناقص) کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں

”وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا“ اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت

لہ آیت کے الفاظ عام ہیں اور یہود، منافقین اور دوسرے تمام معترضین مراد لیے جا سکتے ہیں (مترجم)۔

عادل بنا دیا ہے) یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی شریعت پر ایمان لانے والوں جس طرح ہم نے تمہیں قبلہ اور ملت ابراہیمی کی طرف ہدایت دے کر ایک خصوصیت بخشی ہے اور تمام دوسرے دین والوں پر اس باب میں تمہیں فضیلت دی ہے اس طرح ہم نے تمہیں ایک اور فضیلت اور خصوصیت سے بھی نوازا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ”امت وسط“ بنا دیا ہے۔

امت کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایک دور کے لوگوں اور ایک قسم کے لوگوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسرا لفظ اس ترکیب میں ”وَسَطٌ“ ہے، کلام عرب میں تعریف کے موقع پر بھلائی اور عظمت کے معنی میں آتا ہے۔ قوم میں کسی کے حسب و نسب کی نجابت بیان کرنے کے لیے عرب ”فُلَانٌ وَ اِسِطُّ اَلْحَسَبِ فِي قَوْمِہَا“ استعمال کرتے تھے۔

”وَسَطٌ“ یہاں اس جز کے معنی میں آیا ہے جو دو کناروں کے ٹھیک بیچ میں ہوتا ہے، جیسے ”وَسَطُ الدَّارِ“ دگھر کا درمیانی حصہ۔ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت ”وَسَطٌ“ سے اس لیے بیان کی ہے کہ یہ امت اپنے دین میں غایت اعتدال پر ہوگی، نہ نصاریٰ کی طرح ان میں غلو و افراط ہوگا کہ انہوں نے رہبانیت اختیار کر لی اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا، اور نہ اس امت میں یہودیوں کی طرح عملی کوتاہی اور تفریط ہوگی کہ انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف و تبدیلی کر ڈالی تھی اور اللہ کے انبیاء کا کفر و انکار کے علاوہ بہت سے انبیاء کو انہوں نے قتل بھی کر دیا تھا۔ امت محمدیہ اس طرح کی افراط و تفریط سے پاک ہوگی اور بہت ہی میانہ رو اور غایت اعتدال میں ہوگی۔ میانہ روی اور اعتدال اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس لیے اس خصوصیت کا خاص طور سے ذکر ہوا۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کے معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ”وسط“ کے معنی ”عدول“ (غایت اعتدال میں) ہیں۔ مجاہد، ربیع، عبد اللہ بن کثیر رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی معنی منقول ہے۔ ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امت محمدیہ کا درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری امتوں کے درمیان میں ہے لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الذِّسْوَلُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا“ (تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر) ”شَهِيدًا“ کی جمع ہے (معنی گواہ)۔ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک امت عادل بنا دیا ہے تاکہ تم میرے انبیاء اور رسولوں کے بارے میں اس کی گواہی دو کہ انہوں نے اپنی امتوں کو وہ پیغام پہنچا دیا جس کے لیے میں نے انہیں بھیجا تھا، اور میرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ایمان پر گواہ رہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا آپ نے میرا وہ پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا جسے دے کر میں نے آپ کو بھیجا تھا؟ نوح علیہ السلام عرض کریں گے کہ ہاں، میں نے پہنچا دیا تھا۔ پھر آپ کی قوم سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ میرا پیغام لے کر تمہارے پاس آئے تھے؟ قوم صاف انکار کر دے گی کہ ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اب نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ اس کے متعلق کون گواہ ہے کہ واقعی آپ نے میرا پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا۔ آپ عرض کریں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت!۔ اسی کا بیان آیت میں ہے۔

ابوسعید رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں ہے کہ پھر امت محمدیہ بلانی جائے گی اور وہ شہادت دے گی کہ نوح علیہ السلام نے دعوت اپنی امت تک پہنچا دی تھی۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اپنی امت کے ساتھ قیامت کے

دن ایک ٹیلہ پر ہوں گا اور تمام مخلوق کو اوپر سے ہم دیکھ رہے ہوں گے۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں یہ خواہش نہ پیدا ہو کہ کاش وہ بھی اسی امت کا ایک فرد ہوتا جس نبی کو بھی اس کی امت قیامت کے دن جھٹلائے گی ہم اس کی طرف سے گواہی دیں گے کہ واقعی انھوں نے اپنی قوم کو دعوت الہی پہنچا دی تھی اور ان کی خیر خواہی کے لیے کوشش کی تھی، فرمایا "اور رسول تم پر گواہ ہوں گے"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مرتبہ ایک جنازہ کو دفن کرنے کے لیے نکلا۔ نماز جنازہ کے بعد لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ کیا ہی خوب آدمی تھا۔ آن حضور نے فرمایا کہ واجب ہوگئی۔ پھر ایک دوسرے جنازہ کے لیے میں آن حضور کے ساتھ نکلا۔ نماز جنازہ کے بعد میت کے متعلق لوگ کہنے لگے کہ کتنا بڑا شخص تھا۔ آن حضور نے اس مرتبہ بھی یہی فرمایا کہ "واجب ہوگئی" ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ! آپ نے ارشاد فرمایا کہ "واجب ہوگئی"، اس کا کیا مطلب ہے؟ آن حضور نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر" سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی موقع پر فرمایا تھا کہ فرشتے آسمان پر اللہ کے گواہ ہیں اور تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو، اس لیے تم کسی کے متعلق جس چیز کی گواہی دے دو گے اللہ وہی اس کے لیے واجب کر دے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی "اور آپ کہہ دیجئے کہ عمل کیے جاؤ، سو تمہارے عمل کو اللہ اور اس کا رسول اور مومنین ابھی دیکھے لیتے ہیں" آیت کی تفسیر میں مذکورہ بالا قول، مجاہد، ابو نعیم، عبید بن عمیر اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی اختصار کے ساتھ منقول ہے

زید بن اسلم کی روایت میں ہے نوح علیہ السلام کی قوم قیامت کے دن دعویٰ کرے گی کہ نوح علیہ السلام نے اللہ کا پیغام انھیں نہیں پہنچایا تھا۔ اس پر نوح علیہ السلام کو بلا یا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیوں، آپ نے اپنی قوم کو میرا پیغام نہیں پہنچایا تھا؟ آپ عرض کریں گے کہ یا اللہ، میں نے آپ کا پیغام انھیں پہنچا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آپ کے گواہ کون ہیں؟ عرض کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت! اب امت محمدیہ بلائی جائے گی اور پوچھا جائے گا۔ یہ امت گواہی دے گی کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ قوم نوح کہے گی کہ تمہاری گواہی کس طرح سچی مان لی جائے؟ تم تو ہمارے زمانہ میں تھے ہی نہیں۔ امت محمدیہ کہے گی کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور آپ نے ہمیں خبر دی کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی دعوت پہنچا دی تھی۔ اس گواہی کے بعد نوح علیہ السلام کی تصدیق کر دی جائے گی اور آپ کی قوم کو جھٹلا دیا جائے گا۔ اس کے بعد آن حضور نے مذکورہ بالا آیت تلاوت کی۔

حیان بن ابی جبلہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جمع کرے گا تو سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام کو بلائے گا اور ان سے دریافت فرمائے گا کہ آپ نے میرے احکام (عہد) کا کیا کیا تھا، کیا انھیں پہنچا دیا تھا؟ وہ عرض کریں گے کہ ہاں، یا اللہ، میں نے جبریل علیہ السلام تک پہنچا دیا تھا۔ اب

یعنی صحابہ نے جس میت کی تعریف کی تھی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی اور جس کی برائی کی تھی اس کے لیے دوزخ واجب ہوگئی۔ مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کے واقعی تابع ہیں اور صاحب تقویٰ ہیں کہ عگفتہ اوگفتہ اللہ بود۔ یعنی پرہیزگار اور اللہ سے ڈرتے رہنے والے مومنین جس کے متعلق اچھائی یا برائی کی گواہی دے دیں تو وہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ (امت حرام)

جبریل علیہ السلام کو بلا یا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا اسرافیل نے آپ کو میرے احکام پہنچا دیئے تھے؟ وہ عرض کریں گے کہ ہاں، اے میرے رب! انہوں نے آپ کے احکام مجھ تک پہنچا دیئے تھے۔ اس کے بعد اسرافیل علیہ السلام کو چھوڑ دیا جائے گا اور جبریل علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ کیا آپ نے میرے احکام پہنچا دیئے تھے؟ وہ عرض کریں گے کہ ہاں، اے اللہ! میں نے آپ کے احکام آپ کے انبیاء تک پہنچا دیئے تھے۔ اب انبیاء علیہم السلام کو بلا یا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا آپ لوگوں کو جبریل نے میرے احکام پہنچا دیئے تھے؟ وہ عرض کریں گے، ہاں، اے ہمارے رب!۔ جبریل علیہ السلام کو بھی چھوڑ دیا جائے گا، اور انبیاء سے سوال ہوگا کہ آپ لوگوں نے میرے احکام کا کیا کیا تھا؟ وہ عرض کریں گے کہ ہم نے آپ کے احکام اپنی امتوں کو پہنچا دیئے تھے۔ امتیں بلانی جائیں گی اور سوال ہوگا کہ کیا تمہاری طرف بھیجے جانے والے انبیاء نے تمہیں میرے احکام پہنچا دیئے تھے۔ ان میں سے کچھ انکار کریں گے اور کچھ تصدیق کریں گے۔ انبیاء عرض کریں گے کہ ہمارے پاس اس کے گواہ ہیں اور وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ ہم نے احکام پہنچانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ پوچھا جائے گا کہ تمہاری طرف سے کون گواہی دے گا؟ انبیاء عرض کریں گے کہ امت محمدیہ۔ اب احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بلا یا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا تم اس کی گواہی دے سکتے ہو کہ میرے انبیاء نے میرا پیغام اپنی قوموں کو پہنچا دیا تھا؟ یہ امت عرض کرے گی کہ ہاں، اے ہمارے رب! ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ کے انبیاء نے آپ کا پیغام اپنی قوموں کو پہنچا دیا تھا۔ انبیاء کی منکر قومیں اس پر بول پڑیں گی کہ ہمارے معاملات میں ان کی گواہی کس طرح مان لی جائے گی، یہ تو ہمارے زمانہ میں تھے ہی نہیں!۔ اللہ رب العزت سوال کرے گا کہ ہاں، تم ان لوگوں کے متعلق کس طرح گواہی دیتے ہو جن کے زمانہ میں تم نہیں تھے۔ امت محمدیہ عرض کرے گی کہ اے ہمارے رب! آپ نے ہمارے پاس اپنا رسول بھیجا تھا، اپنی کتاب اور اپنے احکام نازل کیے تھے اور ہمیں بتایا تھا کہ تمام انبیاء نے اپنی قوموں کو آپ کے احکام پہنچا دیئے تھے، ہماری یہ گواہی اسی بنیاد پر ہے۔ اللہ رب العزت فرمائے گا کہ انہوں نے سچ کہا۔

”وَكذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ اُمَّةٍ وَّ سَطْرًا“ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ابن الغم نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت اس دن گواہی دے گی، سوا اس شخص کے جس کے دل میں اپنے کسی بھائی کی طرف سے کینہ ہوگا۔ صحابہ نے فرمایا کہ مراد وہ لوگ ہیں جو ہدایت پر قائم رہے اور یہی لوگ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام کے گواہ ہوں گے۔ عطار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امت محمدیہ ان تمام لوگوں کے خلاف گواہی دے گی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے، کیونکہ ان کی کتاب میں اس کی تفصیلات ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے حق میں اس کی گواہی دیں گے کہ جب حق ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی اور ایمان لائے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لئے گواہی دیں گے اور آپ کی امت دوسری تمام منکر امتوں کے خلاف گواہی دے گی۔ یہ امت ان چار گواہوں میں سے ایک ہوگی جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”وَيَوْمَ يَقُومُ الِاَشْهَادُ“ اور اس روز بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ ایک گواہ فرشتے ہوں گے جو ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کا شمار کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ آیت ”وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَّ سَاهِقٌ“ اور ہر شخص اس طرح آئے گا کہ ایک فرشتہ (فرشتہ) تو اس کے ساتھ ہمراہ لائے والا ہوگا اور ایک فرشتہ (گواہ ہوگا) میں بیان ہوا ہے۔ آپ نے بیان کیا کہ یہ قیامت کے دن ہوگا۔ دوسرے گواہ انبیاء ہوں گے جو اپنی اپنی امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے۔ تیسرے گواہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہوگی جو تمام دوسری امتوں کے بارے میں گواہی دے گی اور چوتھے گواہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، آپ اپنی امت کے

حق میں گواہی دیں گے۔

آزمائش بھی مقصود ہے

«وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِمَّنْ

يَتَّقِلْبُ عَلَى عَقْبَيْهِ» اور جس قبلہ پر آپ اب تک تھے اسے تو ہم نے اسی لیے رکھا تھا کہ ہم پہچان لیں رسول کا اتباع کرنے والوں کو الٹے پاؤں واپس ہو جانے والوں سے۔ یعنی اے محمد! جس قبلہ پر آپ اب تک تھے اور پھر اس کے بجائے دوسرے قبلہ کا حکم اس لیے ہوا ہے تاکہ ہم جان لیں کہ کون واقعی آپ کی اتباع کرنے والا ہے اور کون نہیں ہے۔ «الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا» یعنی وہ قبلہ جس کی طرف، کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے آپ چہرہ کر کے نماز پڑھتے تھے، مراد بیت المقدس ہے۔ سدی اور عطار رحمہما اللہ سے اسی کی روایت ہے۔ بکثرت احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ساتھیوں کی آزمائش بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ بنا کر کی تھی۔ اسی موقعہ پر بعض نے اور کمزور ایمان کے لوگ دین سے پھر بھی گئے تھے اور بہت سے منافقین تحویل قبلہ کے بدلنے نفاق کا، علانیہ اظہار کرنے لگے تھے اور عام بے اطمینانی پیدا کرنے کے لیے کہنے لگے تھے کہ آخر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا ہو گیا ہے، کبھی ہمارا چہرہ دھڑ کر دیتے ہیں اور کبھی آٹھ۔ بعض صحابہ نے اپنے دوسرے ان مسلمان بھائیوں کے بارے میں جو تحویل قبلہ سے پہلے انتقال کر چکے تھے، یہ کہا کہ ان کے اور ہمارے بھی اب تک کے اعمال اکارت گئے اور ضائع ہو گئے۔ مشرکین کہنے لگے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دین کے بارے میں خوب سرگردانی کے عالم میں مبتلا ہیں۔ اس لیے تحویل قبلہ کا یہ حکم سب ہی کے لیے آزمائش تھا اور مومنین کی ثابت قدمی بھی دیکھنی تھی۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ تحویل قبلہ ہم نے اس لیے کیا ہے تاکہ ہم پہچان لیں کہ رسول کی اتباع کرنے والا کون ہے اور الٹے پاؤں واپس ہو جانے والا کون ہے۔ یہ آزمائش اور امتحان کا ایک موقعہ تھا اگر قبلہ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف نہ پھیرا جاتا تو کھرا کھوٹا سب کے سامنے ظاہر نہ ہوتا۔ قنادہ، سدی اور ابن جریر رحمہما اللہ سے یہ روایت ہے۔

سدی کی روایت میں ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد مختلف طرح کے لوگ مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے تھے، منافقین کہنے لگے کہ یہ لوگ بھی عجیب ہیں، کچھ دنوں ایک قبلہ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور پھر کچھ دنوں بعد اسے بدل لیتے ہیں۔ مومنین نے یہ کہا کہ کاش ہمیں اپنے ان بھائیوں کے متعلق معلوم ہو جاتا جو تحویل قبلہ سے پہلے انتقال کر گئے ہیں اور انہوں نے صرف بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے، کیا ان کی عبادات اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوتیں یا نہیں؟۔ یہودیوں نے یہ شوشہ نکالا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں اپنے باپ دادا کے شہر کی پھر ہوگ اٹھی ہے، اگر وہ ہمارے ہی قبلہ پر ثابت قدم رہتے تو ہم سمجھتے کہ ہاں، واقعی وہ ہمارے وہی صاحب ہیں جن کی بعثت کا ہمیں انتظار تھا۔ مشرکین نے ایک نئی صدا بلند کی کہ محمد اپنے دین کے بارے میں بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں، اب انہوں نے اپنے قبلہ سمیت ہماری طرف رخ کر لیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت پر تھے، کوئی حیرت نہ ہوگی کہ اگر وہ ہمارا دین قبول کر لیں۔ اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں، ہر چیز وجود سے بھی پہلے اللہ کے علم میں ہوتی ہے، لیکن آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ تحویل قبلہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ہم پہچان لیں کہ کون ثابت قدم ہے اور کون نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے رسول اور ان کے مخلص صحابہ اور میرے اولیاء کھرے کھوٹے کو پہچان لیں۔ اسی مفہوم کی ادائیگی «إِلَّا لِنَعْلَمَ» (تاکہ ہم پہچان لیں) اسی کی گئی ہے، یعنی تاکہ ہمارے رسول اور ہمارے اولیاء پہچان لیں، کیوں کہ اللہ کے رسول اور اولیاء اللہ کی جماعت کے افراد ہیں

اور عرب رہنا اور رئیس کی طرف ان کا اتباع کرنے والوں کے اسماء کی نسبت کر کے بیان کر دیتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے کہ ”عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سرزمین عراق فتح کی، حالانکہ عراق آپ کے بھیجے ہوئے لشکر نے فتح کیا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ لشکر بھیجنے والے آپ ہی تھے اور اس طرح فتح کا سبب آپ بنے تھے۔“

حدیث قدسی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں بیمار ہوا اور میرے بندے نے میری عیادت نہیں کی، میں نے اس سے قرض مانگا اور اس نے مجھے قرض نہیں دیا، اور مجھے میرے بندے نے گالی دی، حالانکہ اس کے لیے مناسب نہیں تھا کہ مجھے گالی دیتا۔ اسی حدیث کی ایک دوسری روایت میں دگالی دینے کی تشریح بیان ہوئی ہے کہ بندہ کہتا ہے، تپ ہے تجھ پر زمانہ! حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے قرض مانگنے اور عیادت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، حالانکہ مراد دوسرے ضرور تہمذ بندے ہیں، لیکن چونکہ اللہ ہی اس قرض اور عیادت کا سبب تھا اور اسی کا اس سلسلے میں حکم تھا، اس لیے اپنی طرف نسبت کی۔ آیت میں بھی یہی صورت ہے۔ اسی کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے ”تاکہ ہم تمہیں کر دیں، اہل یقین و ایمان اور اہل شرک و شک میں۔ بعض مفسرین نے ”إِلَّا لِنَعْلَمَ“ میں ”علم“ کے معنی ”درویت“ (دیکھنے) کے لیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل عرب ”علم“ کو ”رویت“ کی جگہ اور ”رویت“ کو ”علم“ کی جگہ عام طور سے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے ”أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ“، دیکھا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں سے کیا معاملہ کیا۔ یہاں بھی ”أَلَمْ تَرَ“ میں ”تَرَ“ (درویت سے) ”تَعْلَمَ“ کے معنی میں ہے۔ اسی کے مطابق زیر تفسیر آیت میں ”لِنَعْلَمَ“ ”لِنَرَى“ کے معنی میں ہے، یعنی ”تاکہ ہم دیکھ لیں کون رسول کی اتباع کرتا ہے“ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ”رَأَيْتَ“ ”عَلِمْتَ“ اور ”شَهِدْتَ“ ”قَرِيبَ الْمَعْنَى الْفِطْرَةِ“ اور انہیں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ دور از کار تاویل ہے۔ ”رَوَيْتَ“ (دیکھنے) میں علم لازمی طور پر آجاتا ہے، جب بھی کوئی کسی چیز کو دیکھے گا تو اس کا کسی نہ کسی حد تک علم بھی اسے ہو جائے گا، لیکن علم کے لیے دیکھنا ضروری نہیں ہے، بغیر دیکھے کسی چیز کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ ہے کہ کلام عرب میں وہ رویت ”علم“ کے معنی میں تو ضرور استعمال ہوتا ہے، لیکن ”علم“ رویت کے معنی میں نہیں استعمال ہوتا۔ عربوں سے یہ کسی نے نہیں سنا ہوگا کہ ”أَعْلِمْتَ“ (کیا تمہیں معلوم ہوا) ”أَرَأَيْتَ“ (کیا تم نے دیکھا) کی جگہ استعمال کیا ہو۔ البتہ اس کے برعکس ”أَرَأَيْتَ“ ”أَعْلِمْتَ“ کے معنی میں وہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے آیت میں بھی ”إِلَّا لِنَعْلَمَ“ کو ”إِلَّا لِنَرَى“ کے معنی میں استعمال نہیں کر سکتے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آیت میں ”إِلَّا لِنَعْلَمَ“ (تاکہ ہم جان لیں) اس لیے استعمال کیا کہ منافقین، یہود اور اہل کفر سے نہیں مانتے تھے کہ چیزوں کے وجود سے پہلے اللہ کے علم میں وہ ہوتی ہیں۔ تحویل قبلہ سے پہلے ہی یہ بتا دیا گیا تھا کہ بعض اہل قبلہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے بعد اٹے پاؤں واپس ہو جائیں گے تو ان لوگوں نے کہا کہ جو چیز اب تک وجود میں بھی نہیں آئی ہے اس کا علم اللہ کو آخر کیسے ہو گیا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ لیکن جب قبلہ بدل دیا گیا اور اس کی وجہ سے جنہیں کفر کرنا تھا انہوں نے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور فرمایا کہ ہم نے یہ صرف اس لیے کیا تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ چیزیں وجود سے پہلے ہمارے علم میں ہوتی ہیں۔ ”إِلَّا لِنَعْلَمَ“ کا مفہوم اس صورت میں یہ ہوگا کہ ”تاکہ تم پر واضح ہو جائے کہ ہم پہلے ہی سے جانتے تھے کہ کون رسول کے اتباع میں ثابت قدم رہے گا اور کون اٹے پاؤں لوٹ جائے گا“، یہ بھی دور از کار تاویل ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اگرچہ اللہ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ کون سچا مومن ہے اور کون نہیں ہے، لیکن آیت میں ارشاد فرمایا کہ ”تاکہ ہم جان لیں“۔ یہ طریقہ خطاب محض رفق و نرمی اور بندوں کو طاعت و عبادت کی طرف رغبت دلانے کے لیے اختیار کیا۔ جیسا کہ ایک اور موقع پر فرمایا کہ ”إِنَّا وَإِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ“ (ہم یا تم ہی ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں)۔ یہ مخفی نہیں کہ آں حضور ہدایت پر ہیں اور کفار گمراہی پر۔ لیکن خطاب میں نرم اور ٹھنڈا انداز اختیار کیا گیا اور صاف صاف یہ نہیں کہا گیا کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی پر۔ یہی حال آیت زیر تفسیر کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تاکہ تم لوگ جان لو کیوں کہ تم واقف نہیں ہو۔ لیکن بظاہر نسبت اپنی طرف کی اور فرمایا، ”تاکہ ہم جان لیں“ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے ہی واضح کر دیا کہ ان تمام اقوال میں صحیح پہلا ہی قول ہے۔

”مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ“ سے وہ حضرات مراد ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ کے احکام میں اتباع کریں، پس جس طرف آں حضور اپنا چہرہ کریں وہ بھی اسی طرف کر لیں۔ ”مَنْ يَنْقَلِبْ عَلَيَّ عَقْبَيْهِ“ یعنی اس سے جو اپنے دین سے پھر کر منافق یا کافر بن جائے اور آں حضور کی مخالفت کرنے لگے، تو ان سے وہ لوگ ممتاز ہو جائیں جو آں حضور کے اتباع میں ثابت قدم اور مخلص ہیں۔ ”وَاللَّهُ بِأَعْيُنِنَا“ کا مفہوم یہ ہے کہ جس راستے سے ہو کر آیا تھا اسی راستے سے اٹھنے والے پاؤں اپنی سابقہ جگہ پر واپس چلا گیا۔ پھر ہر اس شخص پر اس کا اطلاق ہونے لگا جو کسی بھی معاملہ میں خواہ دین ہو یا کوئی بھلائی یا اختیار کرنے کے بعد سے چھوڑ دے اور دوبارہ اپنے سابقہ دین اور طریقہ کو اختیار کر لے، یعنی جہاں سے آیا تھا پھر وہیں لوٹ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ذکر ہے کہ ”وَفَارْتَدُّ عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا“ (پھر دونوں اپنے قدموں کے نشان پر اٹھنے چلے)۔ یہاں بھی وہی مفہوم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے رفیق سفر اسی راستے سے اٹھنے والے پاؤں واپس آگئے جس سے خضر علیہ السلام کو تلاش کرتے ہوئے وہ آگے گئے تھے۔

”وَيَانَ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَىٰ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ“ (اور یہ بہت گراں ہے، مگر ان لوگوں کو نہیں جنہیں اللہ نے راہ دکھا دی ہے) اس سلسلے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں کہ آیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ ایک قول یہ ہے کہ مراد تحویل و تولیہ ہے، یعنی بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ بنا کر ان سے، ”كَبِيرَةً“ مؤنث استعمال ہوا، کیوں کہ ”تولیت“ (تحویل) بھی مؤنث ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ سے منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مراد قبلہ ہے، یعنی وہ قبلہ جس کی طرف آپ خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے نماز میں چہرہ کیا کرتے تھے (کچھ لوگوں پر گراں تھا، سو ان کے جنہیں اللہ نے راہ دکھا دی ہے۔ یہ قول ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوا) تیسرا قول یہ ہے کہ مراد وہ نماز (صلوٰۃ) ہے جسے لوگ پہلے قبلہ (بیت المقدس) کی طرف چہرہ کر کے پڑھتے تھے۔ یہ تفسیر ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تمہاری اپنی نماز تم پر بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے پڑھنا گراں تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں قبلہ کی طرف رہنمائی کی۔ پہلا قول میرے نزدیک سب سے بہتر ہے، یعنی آیت سے مراد تحویل قبلہ لیا جائے، کہ ہم نے قبلہ جو بدل دیا ہے تو یہ حکم بہت گراں ہے، مگر ان لوگوں کو نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے کیوں کہ مخالفوں نے اسی تحویل قبلہ ہی کے حکم پر اعتراضات کیے تھے اور یہی حکم لوگوں کے لیے گراں بنا تھا۔ ”كَبِيرَةً“ بمعنی ”عَظِيمَةً“ (گراں، بھاری) ہے۔ ابن زید سے یہی معنی نقل ہے۔ ”وَالْأَعْلَىٰ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ“ یعنی ہمارا قبلہ کی تبدیلی کا حکم اگرچہ بہت گراں ہے، لیکن ان لوگوں پر نہیں جنہیں اللہ نے توفیق دی ہے اور آں حضور اور آپ کی



شریعت پر ایمان و تصدیق اور آپ کی اتباع کی ہدایت دی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر روایت ہے۔  
 ”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّحَ آيَاتِنَا لَكُمْ“ اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع ہو جانے دے، کہا گیا ہے کہ آیت  
 میں ”ایمان“ سے مراد نماز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کے  
 بجائے کعبہ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنے لگے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمارے جو بھائی (مسلمان) اس سے پہلے انتقال کر گئے اور  
 انہوں نے صرف بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ان کا کیا ہوگا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ ”اللہ ایسا نہیں  
 کہ تمہارے ایمان کو ضائع ہو جانے دے۔“ برابر ابن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ مراد ”بیت المقدس کی طرف  
 چہرہ کر کے تمہاری نماز ہے“ قتادہ، سدی، ربیع، داؤد بن ابی عاصم سے بھی اوپر کی روایت کی طرح منقول ہے۔ ابن عباس  
 رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں بصرحت ”إِيمَانُكُمْ“ سے مراد تمہاری وہ نمازیں جنہیں تم نے خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے  
 پہلے پڑھیں، منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تحویل قبلہ کے حکم کے بعد مومنین کے دلوں میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں ان کی وہ نمازیں  
 ہی نہ قبول ہوئی ہوں جو انہوں نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھیں۔ ابن زبیر اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ سے بھی  
 ”إِيمَانُكُمْ“ سے مراد ”صلاّتکم“ منقول ہے۔ ہم اس سے پہلے بیان کرتے ہیں کہ دو ایمان، نام ہے تصدیق کا۔ تصدیق  
 کبھی تنہا زبان سے ہوتی ہے، کبھی تنہا عمل سے ہوتی ہے اور کبھی دونوں سے ہوتی ہے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہوگا  
 کہ ”اور اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ تم نے اپنی ان نمازوں کے ذریعہ جنہیں بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے پڑھا تھا اور اس طرح  
 اس کے رسول کی تصدیق کی تھی، اسے ضائع ہو جانے دے۔ کیونکہ تمہارا یہ عمل بھی میری طاعت اور میرے حکم کے مطابق میری رسول  
 کی تصدیق کی غرض سے صادر ہوا تھا۔“ ”صلاّتکم“ سے مراد یہ ہے کہ ان پر ثواب نہ دے، اور اس طرح انہیں  
 اکارت ہو جانے دے، جیسے آدمی اپنے مال کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے، یعنی ایسے مواقع میں خرچ کرتا ہے جن کا نہ کوئی  
 دنیاوی فائدہ ہو اور نہ دینی۔ تحویل قبلہ کے بعد چوں کہ زندہ مومنین کو بھی یہ الجھن ہو گئی تھی کہ ان کی نمازیں کہیں بے کار اور ضائع  
 نہ ہو گئی ہوں، اس لیے ”وَأِيمَانُكُمْ“ تمہارے ایمان فرمایا، کہ اس میں مردے اور زندے سب آجاتے ہیں۔ اہل عرب  
 اگر مخاطب اور غائب دونوں کے لیے ایک صیغہ یا ضمیر استعمال کرنا چاہتے تو مخاطب ہی کی استعمال کرتے تھے۔  
 ”وَرَأَتْهُ الْبَنَاتُ مِنَ النَّاسِ كَرِيمًا“ اور اللہ تو لوگوں پر بڑا شفیق ہے، بڑا مہربان ہے، یعنی اپنے تمام ہی بندوں پر  
 بڑا شفیق ہے۔ ”وَأَفَاءة“، ”رجس سے“ ”رَدُّوْهُ“، ”نکلا ہے“ ہیں رحمت کے اعلیٰ معانی پائے جاتے ہیں، یہ لفظ عام  
 اور بہت وسیع ہے اور دنیا میں تمام مخلوق کے لیے اور آخرت میں بعض کے لیے رحمت و شفقت کے مفہوم کا حامل ہے  
 لیکن ”رَدُّوْهُ“ کے مفہوم میں رحمت کی خصوصیت صرف مومنین کے ساتھ ہے، دنیا اور آخرت میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان  
 کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر غایت درجہ رحیم و شفیق ہے، کبھی ایسا ممکن نہیں کہ وہ اپنے فرمانبردار  
 بندوں کی طاعت و عبادت کو ضائع ہو جانے دے، یا جو حکم اب تک فرض نہیں ہوا تھا اس پر کوئی مواخذہ کرے۔ یعنی  
 اے مسلمانو! اپنے ان بھائیوں کا غم نہ کھاؤ جو خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے انتقال کر گئے اور انہوں نے صرف  
 بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھی، کیونکہ وہ بھی انہوں نے میری طاعت و عبادت ہی کے لیے کیا تھا اور میں اس  
 پر انہیں پوری پوری جزا دوں گا، میں ان کے حق میں بڑا شفیق، بڑا رحم والا ہوں۔

قَدَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا

ہم آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں اس لیے ہم (وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دینگے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ

جس کے لیے آپ کی مرضی ہے (تو) پھر (حکم ہی دیے دیتے ہیں کہ) اپنا چہرہ (ناز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجئے اور تم سب لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو اپنے چہرہ کو

شَطْرَهُ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَمَا

اسی مسجد حرام کی طرف کیا کرو اور یہ اہل کتاب بھی یقیناً جانتے ہیں کہ یہ (حکم) بالکل ٹھیک ہے (اور) ان کے پروردگار ہی کی طرف ہی (اور)

اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ۝ وَلَئِن آتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہیں اور اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں پیش کر دیں

بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ وَمَا بَعْضُهُمْ

جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے (پھر موافقت کی کیا صورت) اور ان کا

بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٌ وَلَئِن اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ

کوئی (فرق) بھی دوسرے (فرق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا۔ اور اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس

مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝

علم (دھی) آئے پیچھے تو یقیناً آپ (نحوہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں

”قَدَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ (یقیناً ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا آسمان

کی طرف بار بار اٹھنا، پس ہم ضرور آپ کو متوجہ کر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں، سواب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد

حرام کی طرف، خطاب آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ ہم نے آپ کے منہ کا آسمان کی طرف بار بار اٹھنا دیکھ لیا ”تَقَلُّبَ“

بمعنی اٹھنا، پھر ناز۔ ”فِي السَّمَاءِ“ یعنی آسمان کی طرف، اس کی سمت۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے، یہ آیت اس لیے نازل ہوئی

کہ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے حکم سے پہلے آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظر بار بار آسمان کی طرف

اٹھاتے تھے، آپ کو کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کا انتظار تھا۔

چنانچہ قسارہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تحویل قبلہ سے پہلے آن حضور نظر مبارک بار بار آسمان کی طرف اٹھا کر

دیکھتے تھے، آپ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ قبلہ بجائے بیت المقدس کے خانہ کعبہ کو بنا دے، آخر اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کہا

ربیع اور سدیی رحمہما اللہ سے بھی یہ روایت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آن حضور خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کے حکم کو کیوں پسند

کرتے تھے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تو یہود نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ دیکھتے نہیں، ہمارے ہی قبلہ کی طرف چہرہ بھی کرتے ہیں اور ہمارے دین کی مخالفت سے بھی باز نہیں آتے، اس لیے آن حضور نے بیت المقدس کے قبلہ باقی رہنے کو ناپسند کیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب یہودیوں نے اس طرح کے اعتراضات کیے تو آن حضور قبلہ کی تبدیلی کی دعا کرتے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ”ایما تولوا فثرو وجہ اللہ“ (سو جہر کو بھی منہ پھیرو اللہ ہی کی ذات ہے)۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قوم یہود اللہ کے گھروں میں سے ایک گھر بیت المقدس کو قبلہ بنائے ہوتے ہے، ہم بھی کیوں اسی کو اپنا قبلہ بنائیں۔ چنانچہ آن حضور نے سولہ چہینے تک بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ یہودی کہتے ہیں کہ نبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان کا قبلہ کدھر ہے اور ہم نے ان کی رہنمائی کی، تو آن حضور نے اس کے بعد بیت المقدس کو قبلہ بنائے رکھنا پسند نہیں کیا اور آپ آسمان کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر دعا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے قبلہ بنائے جانے کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ یہی آپ کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ تھا۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔ ”فَلَنَوَلِّيَنَّكَ قِبْلَتَكَ تَرْضَاهَا“ یعنی پس ہم ضرور آپ کو پھیر دیں گے بیت المقدس سے اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں اور جس سے آپ محبت رکھتے ہیں۔ ”فَوَلِّي وَنَجِّكَ“ یعنی پس آپ پھیر لیجئے اپنا چہرہ۔ ”وَسَطَّ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ (مسجد حرام کی طرف) میں ”وسط“ کا معنی ہے ”طرف، سمت“ ابن عباس اور براء بن عازب رضی اللہ عنہما اور ابوالعالیہ، مجاہد، قتادہ، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے ”وسط“ کا یہی مفہوم نقل ہوا ہے۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ بیت المقدس کے بجائے جب خانہ کعبہ قبلہ ہوا تو آن حضور کو خانہ کعبہ کی کس مخصوص جگہ کی طرف نماز میں چہرہ کرنے کا حکم ہوا تھا؟ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مراد جبال مینز اب الکعبہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خانہ کعبہ تمام کا تمام ہی قبلہ ہے اور خانہ کعبہ کا قبلہ اس کا دروازہ ہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد صرف یہ ہے کہ ”سواب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف“ اس لیے مسجد حرام کی طرف اور اس کی سمت میں چہرہ کر کے جو بھی نماز پڑھے گا وہ قبلہ کی طرف چہرہ کرنے والا سمجھا جائے گا، نیت ہونی چاہیے کہ قبلہ کی طرف چہرہ کر رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص امام کی اقتدار میں نماز پڑھتا ہے تو اس کے لیے صرف امام کی اقتدار ضروری ہے، یہ ضرور نہیں کہ پیچھے بالکل امام کے محاذ میں کھڑا ہو۔ امام کے پیچھے صف کے سب سے آخری اور بعید گوشے میں بھی کھڑا ہونے والا امام کی اقتدار کرنے والا سمجھا جائے گا، صرف اتنا کافی ہے کہ پیچھے کھڑے ہو کر اس طرف چہرہ کر کے نماز پڑھے جس طرف اس کے امام کا چہرہ ہو۔ یہی صورت حال قبلہ میں بھی ہے۔ قبلہ کے بالکل محاذ میں کھڑا ہونا ضروری نہیں، اور نہ ہر نمازی کے لیے ممکن ہی ہے، صرف سمت کافی ہے، خواہ کعبہ اس سمت میں کھڑے ہونے والے کے دائیں طرف پڑتا ہو یا بائیں طرف، وہ کعبہ ہی کی طرف چہرہ کرنے والا سمجھا جائے گا، ضروری یہ ہے کہ کھڑے ہونے والے کا چہرہ سمت قبلہ سے منحرف نہ ہونا چاہیے۔ علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل ہے۔ اور خود بیت اللہ کا قبلہ اس کا دروازہ ہے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ سے نکلے اور اس کی طرف چہرہ کر کے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا کہ یہی قبلہ ہے۔

”وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ“ (اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے کر لیا کرو اسی کی طرف) یعنی اے مسلمانو! تم روئے زمین کے کسی بھی حصہ میں ہو، اپنی نمازوں میں مسجد حرام ہی کی طرف چہرہ کر لیا کرو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ کہیں بھی ہوں نماز پڑھنے کے لیے خانہ کعبہ کی طرف اپنے چہرے پھیر لیا کریں۔ ”وَرَأَى الَّذِينَ آؤُوا الْكِتَابَ لِيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ“ (اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی ہے وہ یقیناً جانتے ہیں کہ وہ حکم واقعی ان کے پروردگار کی طرف سے ہے)۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ کے علماء ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صرف یہود مراد لیے گئے ہیں کہ وہ اس حکم کو اللہ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں۔ یہ قول سہری سے منقول ہے۔

”لِيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ“ یعنی اہل کتاب کے یہ علماء و احبار خوب جانتے ہیں کہ مسجد حرام کا قبلہ بنایا جانا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اسے ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بنایا تھا اور آپ کی نسل اور آپ کے بعد تمام اللہ کے بندوں کا یہی قبلہ ہے۔ ”مِنْ رَبِّهِمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں پر اسے فرض اور ضروری قرار دیا ہے۔

”وَمَا لِلَّهِ غَافِلٌ عَمَّا يَعْمَلُونَ“ (اور دے مومنو!) جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ غافل نہیں، وہ تمہیں اپنے حکم کی اتباع کرتے ہوئے اور اپنی طاعت و قربان برداری کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے کہ تمہیں جب تک بیت المقدس کی طرف نماز میں چہرہ کرنے کا حکم تھا تم نے ویسا ہی کیا اور پھر جب قبلہ بدل دیا گیا تو اللہ کے اس حکم کو بھی تم نے بے چون و چرا تسلیم کر لیا، وہ کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے، ہر عمل اس کے یہاں محفوظ ہے اور وہ تمہیں سب کا بہترین بدلہ دے گا۔

”وَلَيْتَ اتَّبَعَتِ الَّذِينَ آؤُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ“ (اور اگر آپ ان لوگوں کے سامنے جنہیں کتاب مل چکی ہے ساری ہی نشانیاں لے آئیں پھر بھی یہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پے روی کرنے والے ہیں اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں) یعنی اے محمد! آپ ان یہود و نصاریٰ کے سامنے خواہ کیسی ہی دلیل لا کر رکھیں اور ثابت کروں کہ حق وہی ہے جس کا آپ کو قبلہ کے سلسلے میں حکم دیا گیا ہے، بہر حال یہ اس کی تصدیق نہیں کر سکتے، اور تمام دلائل و ثبوتوں کے باوجود اتباع سے گریز ہی کریں گے۔

”وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ“ یعنی اے محمد! آپ کے لیے ان کے قبلہ کی پیروی کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں، کیونکہ یہودی تو اپنی نماز میں بیت المقدس کی طرف چہرہ کرتے ہیں اور نصاریٰ مشرق کی طرف۔ پس جب کہ ان کے قبلہ کی پیروی بیک وقت آپ کے لیے ممکن بھی نہیں، اس لیے بھی آپ اپنے اسی قبلہ کی پیروی کیجئے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور یہود و نصاریٰ جو طرز و تعریض کر رہے ہیں اس کی طرف توجہ بھی نہ کیجئے۔

”وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ“ یعنی نہ یہود نصاریٰ کے قبلہ کی پیروی کر سکتے اور نہ نصاریٰ یہودی۔ سہری رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح روایت ہے۔ آپ نے بیان کیا کہ جب یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد تو اب اپنے آباء و اجداد کے شہر کے مشتاق ہو گئے ہیں، اگر وہ ہمارے قبلہ پر ثابت قدم رہ جاتے تو ہم بھی مان لیتے کہ وہی ہمارے وہ صاحب ہیں جن کی بعثت کا ہمیں انتظار تھا۔ اس پر ان الذین آؤوا الْكِتَابَ سے لیکر تمون الحق وہم یعلمون تک آیتیں نازل ہوئیں۔ ہم نے جو تفسیر بیان کی اسی کے مطابق ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی بھی روایت ہے۔

«وَلَيْتِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِذْ أَكْمِنَ الظَّالِمِينَ» (اور اگر کہیں آپ بھی ان کی خواہشوں کی پے روی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے تو یقیناً آپ بھی ظالموں میں ہوں گے) یعنی یہ یہود و نصاریٰ جو آپ سے اور آپ کے صحابہ سے یہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے، اے محمد! اگر آپ بھی انہیں خوش کرنے کے لیے کہیں ان کی خواہشات کی پے روی کرنے لگیں اور دوبارہ ان کے قبیلہ کو اختیار کر لیں۔

«مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ» یعنی اس کے بعد کہ میری طرف سے اطلاع کے بعد آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ لوگ باطل پر محض عناد اور دشمنی میں جھے ہوئے ہیں، ورنہ حق ان پر بھی واضح ہے کہ جس قبیلہ کو آپ نے اب اختیار کیا ہے یہی ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بعد آپ کی نسل کے تمام انبیاء کا قبلہ تھا۔ «وَإِنَّكَ إِذْ أَكْمِنَ الظَّالِمِينَ» یعنی اگر آپ نے ایسا کر لیا تو آپ بھی میرے ان بندوں میں سے ہو جائیں گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور میرے حکم و طاعت کو چھوڑتے ہیں۔

الَّذِينَ اتَّبَعَتْ أَهْوَاءَهُمْ لِيُحِبُّوا كَمَا يُحِبُّونَ آبَاءَهُمْ وَإِنَّ

فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ

بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ يَكْتُمُونَ ○ فَالَّذِينَ كَفَرُوا سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

سورہ بقرہ، آیت ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔

شبیہ تک نہیں

«الَّذِينَ اتَّبَعَتْ أَهْوَاءَهُمْ لِيُحِبُّوا كَمَا يُحِبُّونَ آبَاءَهُمْ» یعنی یہود و نصاریٰ کے اجداد اور علماء خوب پہچانتے ہیں کہ خانہ کعبہ ان کا بھی قبلہ ہے، ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ ہے اور آپ سے پہلے تمام انبیاء کا قبلہ ہے، بالکل اس طرح جیسے وہ اپنی نسل والوں کو پہچانتے ہیں۔ قتادہ، روح البیہ، ابن زبیر اور ابن جریر رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہی روایت ہے کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی نسل والوں کو پہچانتے ہیں۔

«وَرَأَى فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ» (اور بے شک ان میں سے کچھ لوگ خوب چھپاتے ہیں حق کو، حالانکہ جانتے ہوتے ہیں) مراد اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہی ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ (وَلَيْكُمُومَنَ الْحَقِّ) میں حق سے مراد یہی قبلہ ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں چہرہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ ارشاد ہے کہ آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں، جو آپ سے پہلے تمام انبیاء کا قبلہ تھا، لیکن یہود و نصاریٰ نے اللہ کے حکم کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے مطابق اس میں تبدیلی کر لی اور بعض نے جانب مشرق کو اپنا قبلہ بنا لیا اور بعض نے بیت المقدس کو۔ اس کے علاوہ انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق معلومات کو بھی چھپایا، حالانکہ توریت و انجیل میں آپ کے متعلق لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آن حضور اور آپ کی امت کو ان کی خیانت پر مطلع کرتا ہے اور

اعلان کرتا ہے کہ جان بوجھ کر یہ لوگ حق کو چھپاتے ہیں اور قصداً اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ قنادہ اور مجاہد رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ توریت و انجیل میں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہوا پاتے ہیں اھداس کے باوجود آپ کے بارے میں حق کو چھپاتے ہیں۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد قبلہ سے

﴿وَالْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ "ارشاد ہے کہ جان لو، اے محمد! حق وہی ہے جو آپ کے رب نے آپ کو بتایا ہے اور اپنے پاس سے آپ تک بھیجا ہے، حق وہ نہیں ہے جو یہود و نصاریٰ کہتے ہیں۔ آیت میں آن حضور ص کو خبر دی گئی ہے کہ جس قبلہ کی طرف اب آپ کو پھیر دیا گیا ہے یہی اللہ کے خلیل ابراہیم اور آپ کے بعد تمام انبیاء کا قبلہ تھا، اس لیے آپ اس حق پر عمل کریں اور شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جائیں۔ ربیع سے یہی روایت ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ ﴿فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ یعنی اس بارے میں شک کرنے والوں میں ہرگز آپ نہ ہو جائیں۔ "مُزِيَةٌ بِمَعْنَى شَكٍّ" سے مَفْتَحِلُّ کے وزن پر ہے۔ ظاہر ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا، اس لیے آیت کے ظاہری الفاظ میں اگرچہ خطاب براہ راست آپ کو ہے، لیکن مراد عام مومنین ہیں۔ ہم نے اس سے پہلے ہیبت سی مثالیں اس کی بیان کی ہیں کہ اہل عرب امر وہی میں بعض اوقات کسی مناسبت کی وجہ سے براہ راست خطاب کسی خاص فرد سے کرتے ہیں حالانکہ مراد دوسرے لوگ ہوتے ہیں

وَلِكُلِّ وُجْهَةٍ هُوَ مَوْلِيَاهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ

اور ہر مذہب والے شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہتا ہے سو تم نیک کاموں میں تگاپو کرو تم خواہ کہیں

بِكُمْ اللَّهُ جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

ہوگے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو حاضر کر دیں گے بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ

قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ط

باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کی طرف رکھا کیجئے اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق ہے (اور) منجانب اللہ (ہے)

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ

اور اللہ تعالیٰ تمہارے کیے ہوئے کاموں سے اصلاً بے خبر نہیں اور (مکرر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں اپنا چہرہ

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ

مسجد حرام کی طرف رکھیے اور تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ اسی کی طرف رکھا کرو

لِيَأْتِيَ كُنُوزًا لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حِجَّةٌ قَالُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلٌ

تاکہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں گفتگو کی مجال نہ رہے (ہاں) مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَمْنَعَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

تو ایسے لوگوں سے (اصلاً) اندیشہ نہ کرو اور مجھ سے ڈرتے رہو اور تاکہ تم پر جو کچھ میرا انعام ہے اُس کی تکمیل کرو اور تاکہ (دنیا میں) تم راہِ راست (حق) پڑو

ہر قوم راست رہے!

”وَلِكُلِّ وُجْهَةٍ مَّا مَوَّلَيْهَا“ اور ہر ایک کے لیے کوئی رخ ہوتا ہے جس پر وہ متوجہ رہتا ہے، یعنی ہر قوم و ملت کے لیے۔ یہاں ”ملت“ کا لفظوں میں ذکر نہیں کیونکہ عبارت سے خود سمجھ میں آجاتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کا ایک قبلہ ہے، نصاریٰ کا ایک قبلہ ہے اور اسی طرح تمہارا بھی ایک قبلہ ہے۔ مجاہد، عطار، ابن جریج، ابن زید، سعدی اور قتادہ رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے۔ لیکن قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دوسری روایت بھی ہے کہ مراد بیت المقدس کی طرف اور پھر اس کے بعد کعبہ کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھنا ہے۔ اس تفسیر کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے محمد! آپ کو اللہ جس طرف بھی نماز میں پھیر دے وہی اللہ کا قبلہ ہے کہ جس پر وہ اپنے تمام بندوں کو پھیرنا چاہتا ہے۔ ”وَجْهَةٌ“ توجُّہ سے مصدر ہے۔ مراد وہ سمت ہے جس کی طرف آدمی اپنی نماز میں رخ کرتا ہے۔ مجاہد، ابن زید اور منصور رحمہم اللہ سے ”وَجْهَةٌ“ قبلہ کے معنی میں نقل ہوا ہے، اور ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے ”ورخ“ کے معنی ہیں۔ ”هُوَ مَوَّلَيْهَا“ یعنی وہ اپنا چہرہ اس (قبلہ) کی طرف کرتا ہے اور اس کا استقبال کرتا ہے۔ یہ معنی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ ”تَوَلَّيْتُ“ (جس سے ”مَوَّلَيْ“ نکلا ہے) آیت میں توجہ و اقبال کے معنی میں ہے جیسے انصوف رآی (رآی کے صلہ کے ساتھ) کے معنی ہیں کہ میری طرف متوجہ ہوا، ورنہ ”انصوف رآی“ کا اصل مفہوم ”کسی چیز سے پھرنے“، لیکن جب رصلة رآی، ”انصوف رآی المثنیٰ“ بولتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں ”اس چیز کی طرف متوجہ ہوا“، یعنی اس کے غیر سے پھر کر۔ یہی حال آیت میں استعمال ہونے والے لفظ ”تَوَلَّيْتُ“ کا ہے۔ اگر ”وَلَّيْتُ عَنْهُ“ استعمال ہوگا رعن کے صلہ کے ساتھ تو معنی ہوں گے کہ ”میں نے اس سے پیٹھ پھیر لی“، لیکن ”وَلَّيْتُ إِلَيْهِ“ کے معنی ہیں ”میں اس کی طرف متوجہ ہوا“، یعنی اس کے غیر سے پیٹھ پھیر کر۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر اہل ملت کا ایک قبلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنا چہرہ اپنے اسی قبلہ کی طرف پھیرتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک قرارت ”هُوَ مَوْلَاهَا“ نقل ہوئی ہے۔ یعنی ہر ایک کے لیے ایک قبلہ ہوتا ہے کہ جس پر اسے پھیرا جاتا ہے۔ اس قرارت میں فاعل یعنی پھیرنے والے کا ذکر نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ ہر اہل ملت کا ایک قبلہ ہوتا ہے جس پر اللہ سے پھیرتا ہے۔ میرے نزدیک پہلی قرارت درست ہے، کیونکہ اس پر تقریباً اجماع ہے، اس کے خلاف جو قرارت ہے وہ نقل و روایت کی حیثیت سے شاذ ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ”فَا اسْتَبَقُوا الْخَيْرَاتِ“ (پس تم نیکیوں کی طرف بڑھو)۔ ”فَا اسْتَبَقُوا“ یعنی بڑھو، جلدی کرو۔ اس کا مصدر ”اسْتَبَقَ“ ہے ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ لے مومنو! میں نے حق تمہارے سامنے واضح کر دیا ہے اور تمہاری اس قبلہ کی طرف رہنمائی کر دی ہے جس کے بارے میں یہود، نصاریٰ اور تمام ملتوں کے گمراہ ہو گئے تھے پس اب تم اعمالِ صالحہ کو اپنے رب کے یہاں ذخیرہ کرنے کے لیے آگے بڑھو اور اپنی اس دنیا میں آخرت کے لیے زاویہ تیار کر لو، میں نے نجات کا راستہ تمہارے لیے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، اپنے قبلہ کی حفاظت کرو اور کھپلی امتوں کی طرح اسے ضائع نہ کرو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ”الْخَيْرَاتِ“ سے مراد اعمالِ صالحہ منقول ہے۔

”وَأَيْنَمَا تَكُونُوا يُبَدِّلْ بِكُمْ اللَّهُ بِمِيعَاتِ اللَّهِ عَلَىٰ كُلِّ مَثَلٍ لَّئِي لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ یعنی تم جس جگہ جس خطہ زمین میں بھی مرو گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم سب کو لائے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ربیع اور سدی رحما اللہ سے یہی منقول ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اپنی طاعت اور آخرت کے لیے تیاری کی ترغیب دی ہے کہ اسے مؤمنوں انیکوں و اعمال صالحہ کی طرف بڑھو اور تمہاری اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ اور ان کے طریقہ کی طرف جو رہنمائی کی ہے اس پر ہمیشہ قائم رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہیں اور انہیں بھی جو اللہ کے دین اور اس کی شریعت کے مخالف ہیں، سب کو جمع کرے گا اور اس دن سب کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا، اللہ تعالیٰ تمہاری مختلف مقامات میں موت کے بعد تمہیں پھر زندہ کرے گا، ایک جگہ جمع کرنے پر اور تمہیں جزا و سزا دینے پر قادر ہے، اس لیے ہر شے کے دن سے پہلے اعمال صالحہ کی طرف بڑھو اور کچھ ذخیرہ آخرت کرتے جاؤ۔

”وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَرَأَيْتَ لَدْحَىٰ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ“ یعنی ”اور آپ جس جگہ بھی نکلیں اور جہاں بھی متوجہ ہوں تو اے محمد! اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں، اور بے شک مسجد حرام کی طرف منہ موڑنا آپ کے رب کی طرف سے امر حق ہے،“ یعنی اس کی حفاظت کرو اور قبلہ کے بارے میں اللہ کے حکم کی اطاعت کو لازم جانو۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو،“ یعنی تمہارے تمام اعمال اس کے یہاں محفوظ ہیں اور وہ ان کا بدلہ تمہیں قیامت میں دے گا۔

”وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَرَأَيْتَ لَدْحَىٰ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ“ یعنی ”اور آپ جس جگہ بھی قیام کریں اور پھر وہاں سے باہر نکلیں تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں، اور اے مؤمنو! تم لوگ بھی جہاں کہیں ہو، اپنی نمازوں میں، اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کرو۔“

۱۳۳۹۸

”لَيْسَ لَكَ يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَيْكَ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَحْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي“ (تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں حجت نہ رہ جائے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں، سو تم ان سے نہ ڈرو، بلکہ صرف مجھی سے ڈرتے رہو مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت میں ”الناس“ (لوگوں) سے مراد اہل کتاب ہیں۔ چنانچہ قتادہ اور ربیع رحما اللہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو قبلہ بنایا تو اہل کتاب نے کہا کہ اب یہ صاحب اپنے جدا مجد ابراہیم علیہ السلام کے گھر اور اپنی قوم کے دین کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ ”حجت“ جس کا ذکر آیت میں ہوا ہے، تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں ”حجت“ نہ رہ جائے“ تو مفسرین نے اس سے اشارہ یہودیوں کے اس قول کی طرف لیا ہے جو وہ آں حضور کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر کہا کرتے تھے، کہتے کہ مجد اور ان کے ساتھیوں کو اپنے قبلہ ہی کا پتہ نہیں تھا، یہ روشنی انہیں ہمیں سے ملی ہے، کبھی کہتے کہ مجد دین کے معاملہ میں تو مخالفت پر تلے ہوئے ہیں لیکن قبلہ کے معاملہ میں ہماری ہی اتباع کرتے ہیں۔ عرب کے بھائل اور مشرک لوگ بھی اس میں خوب دلچسپی لیتے تھے۔ یہی وہ حجت تھی جسے اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں استعمال کرتے تھے اور جو تحویل قبلہ کے بعد باقی نہیں رہی۔ ”إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ“ سے مراد قریش کے مشرک افراد ہیں۔ مجاہد، سدی، ربیع، قتادہ اور عطار رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ بعض روایتوں میں عام مشرکین عرب کا ذکر ہے۔ ”حجت“ کا مفہوم خصومت اور جدال ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”تاکہ کسی بھی شخص کو تمہارے خلاف خصومت اور باطل دعوے کی گنجائش باقی نہ رہ جائے، البتہ عرب کے مشرکین قریش اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ انہیں تمہارے



خلاف بلا وجہ اور بلا کسی حق کے یہ باطل دعویٰ ہے کہ اب جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے تو کچھ دنوں میں ہمارے دین کی طرف بھی لوٹ آئیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کا سرے سے ہی استثناء کر دیا کہ یہ لوگ بلا وجہ کی بجواس کر رہے ہیں۔ جو تفسیر آیت کی ہم نے بیان کی وہی مجاہد، قتادہ، ربیع اور سدی رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت المقدس سے کعبہ مکہ کی طرف پھیر دیا گیا تو مکہ کے مشرک کہنے لگے کہ محمد کچھ گھبرائے ہوئے پریشان سے ہیں، ابھی تو صرف قبلہ تمہاری طرف پھرا ہے، اور یہی اس کی دلیل ہے کہ تمہی حق پر ہو، لیکن بہت جلد دین بھی وہ تمہارا ہی اختیار کر لیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: عطار اور مجاہد رحمہما اللہ سے اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے۔ آیت میں استثناء کی صورت اس جملہ جیسی ہے: "مَا ذَهَبَ بِمِنَ الْمُشْرِكِينَ أَحَدٌ رَّا إِلَّا أَخْوَاكَ"، (سو تمہارے بھائی کے کوئی بھی نہیں گیا) یعنی تمام دوسرے لوگوں سے تو جانے کی نفی ہے، لیکن "بھائی" اس سے استثناء کر لیا گیا ہے۔ یہی صورت آیت میں ہے کہ "تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں حجت نہ رہ جائے، سو ان لوگوں کے جوان میں سے ظالم ہیں، یعنی دوسرے لوگوں سے تو خصومت و جدل کی نفی کر دی ہے، کہ اب کعبہ کو قبلہ بنانے کے بعد ان کی حجت ختم ہو جائے گی، لیکن اس ظالم نفی سے قریش کے ظالم لوگوں کا استثناء کر دیا، کیونکہ انہوں نے اب ایک باطل دعویٰ کھڑا کر دیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اب ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے، اور جلد ہی ہمارے دین کی طرف بھی لوٹ آئیں گے۔ جب مفسرین کے اجماع سے یہ تفسیر ثابت ہوتی ہے جو ہم نے بیان کی تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں "وَاللَّهِ" یعنی واؤ جو وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آیت کا مفہوم یہ بتاتے ہیں کہ "جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے لیے کوئی حجت نہیں ہے، اس لیے آپ ان سے کوئی خطرہ نہ کھائیے" وہ بھی غلطی پر ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ "جن لوگوں نے ظلم کیا" سے مراد اہل عرب کے بعض وہ افراد ہیں جو یہودی یا نصرانی تھے، کیونکہ وہی لوگ آں حضور کے مقابلہ میں حجت کیا کرتے تھے، تمام اہل عرب ایسا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح کے بعض اور اقوال بھی ہیں، جو غلط اور اجماع مفسرین کے خلاف ہیں۔ آیت میں "وَاللَّهِ" سے مراد اہل قریش ہی مراد ہیں جن کے لیے جدل و خصومت کا نیا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی ابو الغالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بحث کرنے لگا کہ موسیٰ علیہ السلام تو صخرہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اس پر ابو الغالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ صخرہ کے پاس کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ یہودی نے کہا کہ پھر ہمارے اور آپ کے درمیان صالح علیہ السلام کی کسی سے فیصلہ ہوگا، آپ نے اسے پہاڑ کھرد کر تعمیر کیا تھا۔ ابو الغالیہ نے فرمایا کہ میں نے اس میں نماز پڑھی ہے اور اس کا قبلہ خانہ کعبہ ہی کی طرف ہے۔ ربیع نے بیان کیا کہ مجھے ابو الغالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی کہ انہوں نے مسجد ذوالقرنین بھی دیکھی تھی اور اس کا بھی قبلہ کعبہ کی طرف تھا۔

"فَلَا تَحْسَبُوهُمْ وَآخِشَوْنِي" یعنی آپ ان لوگوں سے نہ ڈریے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے اور آپ سے حجت اور جدال کرتے ہیں، بلکہ مجھ سے ڈریے، اور میری سزا سے خوف کھائیے کہ اگر تم میں سے کسی نے بھی میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو وہ سزا سے بچ نہیں سکتا۔ اس جملہ میں مؤمنین کو خانہ کعبہ کی طرف نماز میں رخ کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کے بجائے کسی اور طرف رخ کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ یہ خطرہ تم نہ کھاؤ کہ پھر میں تمہیں مشرکین کے دین کی طرف پھیروں گا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ "وَلَا تَدْرِيْ نَحْمِيْ عَلَيْكُمْ" یعنی تاکہ اس طرح میں تمہاری اپنے خلیوں کے قبلہ کی طرف ہدایت کر کے، کہ جنہیں میں نے لوگوں کے لیے امام بنایا تھا، تم پر اپنا انعام پورا کر دوں

اور..... ملت حنیفیہ مسلمہ کی شراعی کی تکمیل کروں، یہی وہ ملت تھی جس کی اللہ تعالیٰ نے نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور تمام دوسرے انبیاء کو وصیت کی تھی اور یہی وہ نعمت ہے جس کی تکمیل آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ پر ہوئے والی تھی۔ "لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" یعنی تاکہ تم صحیح قبلہ کی طرف ہدایت پا جاؤ۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ

جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک بزرگ شان رسول کو بھیجا (جو کہ تم ہی میں سے رہیں اور وہ) ہماری آیات و احکام پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور تمہیں

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَلْمُذُوا تَعْلَمُونَ

تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں اور تم کو کتاب (الہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونَ

ان (نعمتوں) پر مجھ کو یاد کرو میں تم کو (نعمت سے) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گزاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو

حضور اکرمؐ کی بخت اور اس کا مقصد

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ  
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَلْمُذُوا تَعْلَمُونَ

یعنی جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا، تاکہ ملت حنیفیہ کی شراعی کو بیان کرے کہ ہم تم پر اپنی نعمتوں کو پوری کر دیا اور اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے دین کی طرف تمہاری ہدایت کر دیں، وہ دعا جو انہوں نے کی تھی اور تم سے مانگا تھا کہ "ارے رب! ہمیں اپنا حکم دانا رکھیے اور ہماری نسل سے بھی ایک امت پیدا کیجئے جو آپ کی حکم برداری کرے اور ہمیں ہمارے مناسک دکھا دیجئے اور ہماری توبہ قبول کیجئے، بے شک آپ بڑے ہی توبہ قبول کرنے والے رحم کرنے والے ہیں" اسی طرح ہم نے ان کی اس دعا کو بھی قبول کیا کہ "ان میں ایک رسول انہیں میں سے بھیجئے، جو ان پر آپ کی آیات کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، یقیناً آپ بڑے غالب بڑے حکمت والے ہیں" چنانچہ اپنے خلیل ابراہیم اور ان کے صاحبزادے اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کے نتیجہ میں میں نے اپنا ایک رسول تمہاری طرف بھیجا ہے۔ یہ آیت "وَلَا تَقْرَبُوا مَنَاسِكَكُمْ" کے صلہ کے طور پر ہے، "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ" سے متعلق نہیں ہے جو اس کے بعد آ رہا ہے، کیونکہ عربوں کے استعمال سے مطابقت نہیں کھاتا۔ لیکن ابونجیح اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ آیت زیر تفسیر کا تعلق آگے کی آیت "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ" ہی سے جوڑتے ہیں اور اسے اس کا جواب قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تصریح کی گئی، یہ ترکیب کلام عرب کے خلاف ہے۔ "کہنا اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا" کا مفہوم یہ ہے کہ اے عرب، میری طاعت کو لازم پکڑ لو اور اس قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے، تاکہ یہود کی حجّت باقی نہ رہے، اور تاکہ میں اپنا انعام تم پر پورا کروں اور تم ہدایت پا جاؤ، جیسا کہ میں نے تمہاری طرف..... نہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔ "رسول" جو عربوں کی طرف سے بھیجئے گئے تھے، سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ "وَيَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا" میں آیات سے مراد قرآن ہے۔ "وَيُزَكِّيكُمْ" یعنی تمہیں گناہوں کے میل سے پاک کرتا ہے۔ "وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ" میں کتاب سے مراد فرقان ہے، یعنی وہ تمہیں کتاب الہی کے احکام کی تعلیم دیتا ہے

”حکمت“ سے مراد سنت اور دین کی سمجھ ہے ان تمام امور کی تفصیل ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ”وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ“ یعنی تمہیں انبیاء کے حالات، گذشتہ امتوں کے واقعات اور بہت سے وہ امور جو آئندہ پیش ہونے والے ہیں اور جن کا عربوں کو کوئی علم نہیں، سب کی تمہیں تعلیم دیتے ہیں، اس لیے آں حضور سے تم ان تمام امور کا علم حاصل کرو۔ ”فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ“ یعنی اے مومنو! مجھے تم یاد کرتے رہو، ان تمام معاملات میں اپنی طاعت کے ذریعہ جن کامیں نے تمہیں حکم دیا ہے یا جن سے رد کا ہے تو میں بھی تمہیں اپنی رحمت و مغفرت کے ذریعہ یاد کرتا رہوں گا۔ یہ تفسیر سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ لیکن ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ ”ذکر“ سے مراد شکر و شکر ہے، آپ نے فرمایا کہ جو اللہ کو یاد کرتا ہے اللہ بھی اسے یاد کرتا ہے، جو شکر کرتا ہے اس کے لیے فریاد اضافہ کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے اسے عذاب دیتا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔

”وَأَشْكُرُ وَاِلٰی وَلَا تَكْفُرُوْنَ“ یعنی اے مسلمانو! ایمان اور اس راستے کی طرف جس کی میں نے تمہیں ہدایت دی ہے اور جو انبیاء و اصفیاء کا راستہ تھا، اس کے لیے تم شکر ادا کرو، اور میرے احسان کا کفر نہ کرو کہ تم پر جو انعامات ہیں وہ بھی چھین جائیں۔ شکر کرو گے تو اور پاؤ گے۔ ہم اس سے پہلے لکھ آئے ہیں کہ ”شکر“ کا مفہوم ہے کسی آدمی کی اس کے اچھے اور پسندیدہ عمل پر تعریف، اور ”کفر“ نام ہے کسی چیز کو چھپا دینے کا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے ایمان والو! دُعا کرنے کے لیے صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو بلاشبہ حق تعالیٰ دہر طرح سے صبر کرنے

الصَّابِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ

والونکے ساتھ بہتر ہیں (اور نماز پڑھنے والونکے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ) اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (موتی ہوئی)

أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَلَسَبَلُونَكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ

طرح (مردی ہیں بلکہ وہ تو ایک ممتاز حیات کیساتھ زندہ ہیں لیکن تم ان (خوف) سے (اس حیات) کا اور انہیں کر سکتے۔ اور وہ کچھ بھی تمہارا امتحان کیونکر کسی قدر خوف

وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ

اور فاقہ سے اور کسی قدر مال اور جان اور بچھوں کی کمی سے۔ اور آپ ایسے صابریں کو بشارت

الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ

سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ددل سے یوں کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد حقیقہ) اللہ

وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ

ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں ان لوگوں پر (بہر اجداد) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہونگی

# وَ رَحْمَةٌ قَدْ وَأَوْلَيْكَ هُوَ الْمَهْتَدُونَ ○

اور (سب پر بلاشکر) عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقت حال تک) رسائی ہو گئی

## صبر و نماز کی تلقین

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو طاعت و بندگی اور جسمانی و مالی مصائب اور پریشانیوں کے لیے صبر اور نماز کے ذریعہ مدد دیا ہو، تم نے اگر ناپسندیدہ و ناگوار امور پر صبر کیا تو تمہیں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی اور نماز سے تمہاری مشکلات کی گریز کھلیں گی، کیونکہ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو میرے فرائض کی ادائیگی میں، اور گناہوں کو چھوڑنے میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ آیت کی تفسیر میں ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ صبر و نماز سے مدد چاہو کہ یہ اللہ کی طاعت ہیں اور اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ۔ ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ“ یعنی اللہ اس کا مددگار اور پشتیبان ہے اور اس کے کام سے راضی اور خوش ہے

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَمْوَاتٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ“ یعنی اے مومنو، صبر اور نماز سے دو چار ہو، اور جو اللہ کے راستے میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو، کیونکہ مردہ (میت) وہ کہلاتا ہے جس کی زندگی سلب کی جائے اور اس کے حواس باقی نہ رہیں، نہ کسی چیز کے مزے کا احساس اسے ہو اور نہ نعمتوں کا، لیکن تم میں سے جو لوگ میرے راستے میں قتل ہوئے ہیں وہ میرے یہاں زندہ ہیں اور ان کی زندگی نہایت عمدہ اور قابل رشک ہے، میں نے ان کے لیے اپنے فضل سے ہر طرح کی نعمتیں ہتیا کی ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شہداء اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، اور اگرچہ وہ جنت میں نہیں رکھے جاتے، لیکن جنت کے پھلوں سے انہیں روزی دی جاتی ہے اور اس کی خوشبو ان کے پاس آتی رہتی ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، شہیدوں کی ارواح سفید پرندوں میں رکھی جاتی ہیں، جنت کے پھلوں کی انہیں روزی ملتی ہے اور ان کا مسکن سدرة المنتہی پر ہوتا ہے، مجاہد کی تین خصوصیات ہیں، اگر وہ اللہ کے راستے میں قتل کیا جاتا ہے تو زندہ رہتا ہے اور اسے روزی دی جاتی ہے، اگر غالب آتا ہے تو اللہ اسے بہت بڑا اجر دیتا ہے اور اگر وفات پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ عمدہ روزی سے اسے نوازتا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ شہداء سبز پرندوں کی صورت میں جہاں چاہیں گے جنت میں اڑتے رہیں گے اور جہاں سے چاہیں گے کھائیں پئیں گے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔

جہاں تک اس دنیاوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد برزخی زندگی کا تعلق ہے تو وہ عام مومنین بلکہ کفار کو بھی حاصل ہوتی ہے

اس دنیاوی زندگی کے ختم ہونے اور اخروی زندگی کے شروع ہونے کے درمیانی عرصہ میں مردہ کی روح جہاں رکھی جاتی ہے اس کا نام ہے ”برزخ“۔ یہ مدخ ہماری اس دنیا سے قطعاً مختلف اور اس دنیا میں جب تک ہم ہیں ہمارے لیے ایک غیر مرنی چیز ہے۔ یہ آخرت کی زندگی کا ایک دروازہ ہے اور دنیا کے اعمال کا بدلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے قیامت کے بعد آخرت کی زندگی شروع ہوگی۔ ”برزخ لغت عرب (باقی برزخ)“

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اتر کے ساتھ اس مضمون کی احادیث ثابت ہیں کہ مرنے کے بعد مومن بندوں کے لیے جنت کے دروازے ان کی قبروں کی طرف کھول دیے جاتے ہیں، وہ جنت کی شمیم سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ قیامت جلدی آجائے، تاکہ وہ اپنے مسکن میں جلدی پہنچ جائیں اور وہاں اپنے اعزہ واقارب اور متعلقین کے ساتھ ملیں۔ لیکن کفار کا حال اس سے مختلف ہوتا ہے، ان کی قبروں کی طرف جہنم کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، وہ اس کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کی بدبو اور مکروہات سے ان کا بُرا حال رہتا ہے، اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ قیامت دیر میں آئے۔ شہداء کو بھی برزخی زندگی ہی حاصل ہوتی ہے، لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں برزخ میں جنت کی روزی بھی ملتی ہے، وہ صرف اس کی ہواؤں کا ہی لطف نہیں اٹھاتے بلکہ وہ تمام لذتیں اور راحتیں انھیں ملتی ہیں جو صرف اہل جنت کا حصہ ہیں اور قیامت سے پہلے شہیدوں کے سوا اور کسی کو نہیں ملتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا کہ انھیں مردہ نہ جیاد کرو، وہ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس سے روزی دیئے جاتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شہداء جنت کے دروازے پر ایک نہر کے کنارے سبز گنبد میں رہتے ہیں اور جنت سے ان کے لیے صبح و شام روزی آتی ہے۔ آیت سے مقصود صرف ان کی زندگی کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ مقصد ان کی ان نعمتوں کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے جو برزخ میں صرف انھیں کو حاصل ہوتی ہیں۔ آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کو مردہ کہنے سے لوگوں کو منع کیا ہے۔ "وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُوْنَ" یعنی تم کوئی انھیں دیکھتے نہیں کہ تمہیں ان کی زندگی کا حال معلوم ہو سکے، اس کا علم تو صرف میرے بتانے کے بعد ہی ممکن ہے۔

آزمائش ہوگی

اور ہم تمہاری آزمائش کر کے رہیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال اور جان اور بھلوں کے کچھ نقصان سے اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجئے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کو اطلاع دی ہے کہ انھیں مصائب و مشکلات کے ذریعہ آزمایا جائے گا اور یہ بات کھول دی جائے گی کہ کون اپنی اتباع میں ثابت قدم اور مخلص ہے اور کون غیر مخلص اور پیچھے ٹوٹ جانے والا ہے۔ اس سے پہلے قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ بنا کر مسلمانوں کو آزمایا گیا تھا اور اس سے بھی پہلے کھجلی امتوں کے پاکباز لوگوں کو آزمایا جا چکا تھا۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ "کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ دراصل حالے کہ ابھی تم پر ان لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، انھیں تنگی اور سختی پیش آئی، اور انھیں ہلا ڈالا گیا، یہاں تک کہ پیر اور جو لوگ ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی امداد آخر کب آئے گی، سن رکھو کہ اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے۔" یہی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ دنیا امتحان اور آزمائش کی جگہ ہے، مسلمانوں کو بھی یہاں آزمایا جائے گا۔ پھر انھیں صبر کی تلقین کی اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنائی۔ پھر ارشاد ہے کہ یہاں اس سے پہلے بھی ہمیشہ انبیاء اور اولیاء کو آزمایا جاتا رہا ہے۔ "وَلٰكِنْ تَلَوْنَهَا" یعنی ہم تمہاری آزمائش کریں گے۔ ابتلاء کا مفہوم ہم اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر آئے ہیں۔ "وَبَشِيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ" سے مراد دشمن کا خوف ہے "وَالْجُوعِ" یعنی

(دقیقہ صفحہ ۲۶) میں دو چیزوں کے درمیان کی روک، یا دو چیزوں کی درمیانی حالت کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

قحط مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں دشمن کے خوف اور قحط سالی کے ذریعہ آزمائیں گے، کچھ تمہارے دشمنوں سے تمہاری لڑائیاں ہوں گی، قحط پڑے گا اور اس طرح تمہارے مال اور تمہاری تعداد میں کمی ہوگی، اس کے علاوہ تمہاری اولاد، اہل خاندان کی موت کا تمہیں صدمہ اٹھانا پڑے گا، قحط سالی کے نتیجے میں پھلوں کی کمی ہوگی۔ یہ سب کچھ ہوگا اور تمہاری آزمائش کے لیے ہوگا پھر معلوم ہو جائے گا کہ کون ایمان میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے، جو لوگ تمہارے یہاں صاحب بصیرت ہیں انہیں منافقوں کا بھی اسی میں پتہ چل جائے گا۔ آیت میں خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کو ہے، جیسا کہ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آزمائش ہو چکی ہے اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔ آگے کی آیات میں اسی لیے ارشاد ہے کہ ”اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجئے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں“

”وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ یعنی جو لوگ میرے امتحان پر پورے اثر کے ہیں جن اعمال سے میں نے منع کر دیا ہے، مشکل حالات میں بھی اس کی طرف نہیں بڑھتے اور جن امور کا میری طرف سے حکم ہے کسی آزمائش میں بھی اسے ہاتھ سے جانے دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، بلکہ ایسے اوقات میں ان کی زبانوں پر ہوتا ہے کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف واپس لوٹنا ہے ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ایسے لوگوں کو میری طرف سے خاص طور سے بشارت سنا دیجئے، ان کی یہ استقامت رازگاہیں نہیں جائے گی، کہ انہوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی میری رہبریت، مدد و حمایت، آخرت کی تصدیق اور میری ہی طرف واپس لوٹنے کی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، سارا فیصلہ انہوں نے مجھی پر چھوڑا ہے، میرے ثواب کی امید اور میرے عقاب سے خوف رکھتے ہیں۔

”وَأُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ“ مراد وہی صابرین ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا، ارشاد ہے کہ ان پر اللہ کی مغفرت ہوگی، اللہ کی اپنے بندوں پر درود و صلوات، کا مطلب ”اللہ کی اپنے بندوں کے لیے مغفرت“ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى آلِ أَبِي أَدُوْنِي“ کا بھی مفہوم یہی ہے کہ ”اے اللہ، آل ابی ادونی کی مغفرت کر دے“ ”مور رحمۃ“، یعنی اللہ کی مغفرت اور گناہوں کی معافی کے علاوہ اس کی ”رحمت“ اور نوازشات بھی ان پر ہوں گی۔ اس ذکر کے بعد کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت ان پر ہے، ارشاد ہے کہ وہی راہ یاب ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تو من جب معاملہ اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور مصیبت کے وقت ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ (بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ کی طرف سے مغفرت، اس کی رحمت اور راہ یابی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مصیبت کے وقت انا اللہ الخ پڑھنے والے کی مصیبت اللہ تعالیٰ جوڑ دیتا ہے، اس کی آخرت سدھار دیتا ہے اور اولاد صالح عطا فرماتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس امت مسلمہ کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ کسی امت کو نہیں ملا، پھر آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی کہ مصیبت کے وقت جو لوگ ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھتے ہیں انہیں اللہ کی مغفرت اور رحمت ملتی ہے، اگر کسی اور کو یہ دولت ملتی تو یعقوب علیہ السلام کو ضرور ملتی، لیکن آپ کی زبان سے بھی مصیبت کے وقت یہ الفاظ نکلے ”يَا أَسْفَىٰ عَلَىٰ يُوْسُفَ“

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ

تحقیقاً صفا و مروہ یادگار (دین) خداوندی ہیں سو جو شخص حج کرے بیت (اللہ) کا یا (اس کا) عمرہ کرے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا

اُس پر ذرا بھی گناہ نہیں (ہوتا) ان دونوں کے درمیان آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے) اور جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے

فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ

حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدر دانی کرتے ہیں اور اس خیر کو نوالے کی نیت خلوص) خوب جانتے ہیں۔

اللہ کے شعائر

”إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ“ ”الصَّفَا“ صفا کی جمع ہے، چکنے پتھر کی چٹان کو کہتے ہیں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ”صفا“ واحد ہے، اس کا تشبیہ دو کے لیے ”صَفْوَان“ اور جمع (دین یا اس سے زیادہ) ”أَصْفَاء“ صَفْبَاءِ وغیرہ سے ”مَرْوَةَ“ چھوٹی کنکر یوں کہتے ہیں، جمع قلت (دین سے تو تک کے لیے) ”مَرْوَات“ اور جمع کثرت ”مَرْو“ استعمال ہوتی ہے، جیسے تَمْرَةٌ، تَمْرَاتٌ اور تَمْرٌ علی الترتیب استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں ”صفا“ اور ”مَرْوَةَ“ سے دو پہاڑ مراد ہیں جو ان ناموں کے حدودِ حرم میں موجود ہیں۔ ”مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ“ یعنی دونوں پہاڑیاں اللہ کی طرف سے علامتیں ہیں جو اس نے اپنے ذکر کے لیے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں، بندے وہاں پہنچ کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، دعا کے ذریعہ، ذکر کے ذریعہ یا ان امور کی انجام دہی کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے وہاں پر فرض کیے ہیں۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے شعائر کے بارے میں فرمایا کہ وہ خبر ہیں جو میں تمہیں بتاؤں گا۔ اصل میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ ”شَعَائِرُ“ شَعَائِرُ کی جمع ہے اور ”شَعَارُ“ سے نکلا ہے یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کو صفا اور مروہ اور اس سے متعلق طواف وغیرہ کی خبر دیتا ہے۔ یہ تفسیر بڑی دور از کار ہے، اللہ تعالیٰ نے تو یہاں یہ بتانا چاہا ہے کہ صفا اور مروہ اللہ کی طرف سے دو علامتیں ہیں جو اس نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس وقت بتائی تھیں جب انھوں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ مجھے مناسب حج دکھا دے۔ آیت کے الفاظ اگرچہ خبر کے ہیں، لیکن مراد حکم ہے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت کی اتباع کا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بعد میں آنے والے تمام لوگوں کے لیے امام بنا کر بھیجا تھا۔

”فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ“ حَجَّ الْبَيْتَ یعنی قصد کر کے جو بیت اللہ آئے، ہر وہ شخص جو کسی چیز کے پاس بار بار جاتا ہو، اس چیز کی طرف نسبت کر کے اسے ”حاج“ کہیں گے حج کرنے والے کو بھی ”حاج“ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بیت اللہ عرفات کے میدان میں ٹھہرنے سے پہلے آتا ہے، پھر دوبارہ وقوف عرفات کے بعد قربانی کے دن طواف کے لیے حاضری دیتا ہے، اس کے بعد منیٰ چلا جاتا ہے اور پھر طوافِ صدر کے لیے حاضر ہوتا ہے۔ اس طرح چونکہ اسے بار بار بیت اللہ آنا پڑتا ہے اسی لیے اسے ”حاج“ کہتے ہیں عمرہ کرنے والے کو ”مَعْتَمِر“ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کے طواف اور اس کی زیارت کے بعد واپس آجاتا ہے۔ آیت میں ”أَوْ اعْتَمَرَ الْبَيْتَ“ کے معنی ہیں ”یا بیت اللہ کا عمرہ

(۱) حاشیہ بر صفحہ آئندہ

کرے، "اعتمار" کے اصل معنی زیارت کے ہیں "اعتمر" یعنی بیت اللہ کا قصد و ارادہ کیا۔

"فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ يَطُوفَ بِهِمَا" تو اس پر ذرا بھی گناہ نہیں اگر وہ ان دونوں کے درمیان آمد

ورفت کرے۔ آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام سے پہلے ان دونوں پہاڑیوں، صفا اور مروہ پر دو بت رکھے

ہوئے تھے اور زمانہ جاہلیت میں مشرکین ان دونوں بتوں کی تعظیم میں دو پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت کرتے تھے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ فضا کیا تو آپ کے بہت سے صحابہؓ، جنہوں نے جاہلیت میں ان بتوں کی تعظیم

کے لیے ان دونوں پہاڑیوں کا طواف کیا تھا، گھبرائے اور کہنے لگے کہ اللہ کے سوا کسی بھی چیز کی عبادت تو شرک ہے،

ان پہاڑیوں کے درمیان ہم کیسے آمد و رفت کر لیں؟۔ جاہلیت کے زمانہ میں ان کے درمیان آمد و رفت بتوں کی تعظیم

کے لیے کی جاتی تھی، لیکن اب تو اسلام آچکا ہے، ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی تعظیم و عبادت کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ "صفا اور مروہ تو اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں" مراد ان کے درمیان آمد و رفت سے ہے،

چوں کہ یہ معلوم تھا، اس لیے الفاظ میں اس کا ذکر نہیں کیا، اس لیے جو لوگ اب اسلام کے بعد ان کے درمیان آمد و رفت کریں

انہیں جاہلیت کے ان بتوں کے خیال سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ لوگ تو اللہ کے کفر اور شرک کے

جذبہ سے ان کا طواف کرتے تھے اور تم ایمان و تصدیق کے جذبہ سے ان کے درمیان آمد و رفت کرو گے، اس لیے ان کے درمیان

آمد و رفت کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہو جتنا کہ "بمعنی اثم، گناہ ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تم پر کوئی گناہ

نہیں، بلکہ اس کے درمیان سعی میں تمہارے لیے اجر و ثواب ہے۔ ہم نے آیت کی جو تفسیر بیان کی وہ صحابہؓ و تابعینؓ سے بتواتر

ثابت ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ جاہلیت میں ایک بت صفا پر تھا اور اس کا نام دو اساف تھا اور ایک

بت مروہ پر تھا، اس کا نام دو نائکہ تھا۔ مشرکین بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد ان دونوں بتوں پر بھی ہاتھ پھیرنے آتے تھے

جب اسلام کو غلبہ ہوا اور یہ بت توڑ دیئے گئے تو صحابہؓ کو ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت کرنے میں تامل ہوا۔ اس پر یہ

آیت نازل ہوئی۔ انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے

بھی اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے۔

ایک دوسرا قول آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ ایسے لوگ تھے جو صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت

کرنے نہیں جاتے تھے، جب اسلام آیا تو جاہلیت کے پرانے تخیل کے مطابق ان کی سعی کرنے میں انہیں خوف محسوس ہوا،

اس پر آیت نازل ہوئی۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تہامہ کا ایک قبیلہ زمانہ جاہلیت میں صفا اور مروہ کی سعی

دعاشیہ صفحہ گذشتہ) لہ "حج" عبادت اسلامی کا چوتھا رکن ہے۔ امت کے ہر فرد پر خواہ کسی جگہ کارہنہ والا ہو، بشرط صحت استطاعت

و امن راہ عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ حج میں تین چیزیں فرض ہیں (۱) حدود حرم میں داخلہ سے پہلے احرام کا لباس یعنی خاص شرائط کے

ساتھ بے سلا ہوا لباس پہننا (۲) ۹ رذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں حاضری، اصطلاح میں اسے وقوف عرفہ کہتے ہیں (۳) طواف زیارت

یعنی وقوف عرفہ کے بعد خانہ کعبہ کا طواف۔ عمرہ، اس کا دوسرا نام حج اصغر ہے۔ اس میں حج کی طرح ہینہ اور تاریخ کی قید نہیں اور نہ

اس میں وقوف عرفات ہے۔ عمرہ کی نیت سے احرام حدود حرم سے باہر باندھنا چاہیے، پھر طواف کعبہ اور اس کے بعد صفا اور

مروہ کے درمیان آمد و رفت یعنی سعی کرے۔ عمرہ پورا ہو گیا، اب وہ احرام کھول سکتا ہے۔



نہیں کرتا تھا، اسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ صفا اور مروہ بھی اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں اور ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنا براہیم اور اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔

عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے آیت کے متعلق عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت کرنے (د سعی) میں کوئی گناہ نہیں، یعنی اگر سعی نہ کی جائے جب بھی کوئی حرج نہیں ہوگا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم نے آیت کا غلط مطلب نکالا، آیت اصل میں انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اسلام سے پہلے وہ اپنے بت "مناتہ" کے لیے، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان راستے میں رکھا ہوا تھا، احرام باندھتے تھے اور ان کے بہت سے افراد صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں حرج محسوس کرتے تھے، اسلام کے بعد جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ "صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت کرنے (د سعی) میں کوئی حرج نہیں" عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت کی سنت قائم کی ہے، اس لیے کسی کے لیے اس کا ترک جائز نہیں۔ ابو بکر بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے اہل علم کے حوالہ سے بیان کیا کہ جب بیت اللہ کے طواف کے لیے بصراحت آیت نازل ہوئی اور صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا تو بہت صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاثر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سعی کا تو کوئی ذکر کیا نہیں، سعی کرنی بھی چاہیے یا نہیں؟ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے حضرات نے سوال کیا کہ ایسی صورت میں کیا ہمارے لیے کوئی حرج ہے کہ ہم صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت (د سعی) نہ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بہر حال آیت کے نازل ہونے کی مذکورہ دونوں وجہیں ہو سکتی ہیں۔

صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت (د سعی) کے سلسلے میں کسی مسلک میں ایک مسلک کے مطابق ان کے درمیان سعی واجب ہے، اس کے بجائے فدیہ سے اس کی کفایت نہیں ہوتی، بلکہ اگر کوئی شخص اسے چھوڑے گا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دوبارہ اعادہ کرے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما سے یہی روایت ہے۔ دوسرا قول امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو چھوڑ دینے والا شخص اگر دوبارہ سعی کر لیتا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اس پر اس کے بدلہ میں ایک قربانی واجب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ سعی صرف نفل ہے اور چھوڑنے کی صورت میں کوئی قربانی یا فدیہ واجب نہیں۔ یہ حضرات آیت کو "وَفَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ لَا يَطُوفَ بِهِمْ" پڑھتے ہیں۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول روایت ہے۔ آپ مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے استدلال کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرابت بھی اس قول کی تائید میں ہے۔ عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نفل ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ صفا اور مروہ کی سعی فرض واجب ہے اور جو شخص اسے چھوڑے گا اس کی قضا اس پر واجب ہوگی، خواہ قصداً چھوڑے یا بھول کر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل روایات اس کی تائید میں موجود ہیں

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر صفا پہاڑی کے قریب پہنچے تو مذکورہ آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ تم بھی اپنے عمل کی دہلیز سے ابتداء کرو جس کے ذکر سے اللہ نے ابتداء کی ہے، چنانچہ آپ نے صفا سے سعی کی ابتداء کی اور اس پر چڑھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ بیت اللہ کے طواف کا جس طرح کوئی فدیہ نہیں، اور چھوڑنے والے کے لیے اس کی قضا ضروری ہے، یہی صورت صفا اور مروہ کی سعی میں بھی ہوگی

دونوں طواف ہی کہلائیں گے، ایک میں بیت اللہ کا طواف ہے، دوسرے میں صفا اور مروہ کا، جو لوگ ان دونوں میں فرق کرتے ہیں انھیں اس کی وجہ بتانی ہوگی۔ تیسرے قول کی تائید میں جو قرابت "لَا يَطْوُونَ" کی ذکر کی گئی ہے وہ تمام مشہور و متواتر مصاحف کے خلاف ہے اور اسے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

«وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ» (اور جو کوئی خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو اللہ بڑا قادر دان ہے، بڑا علم رکھنے والا ہے)۔ یعنی اپنے اوپر فرض حج کی ادائیگی کے بعد جو کوئی اپنی خوشی سے حج یا عمرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کے قدر دان ہیں اور انھیں نیتوں کا بھی خوب علم ہے، وہ اس کا بدلہ ضرور دیں گے۔ بعض لوگ آیت سے یہ معنی نکالتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی نفل ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی روایت ہے۔ اس قول کی بنیاد پر مطلب یہ ہوگا کہ "جس نے صفا اور مروہ کے درمیان آمد و رفت اپنی خوشی سے کی، تو اللہ اس کی اس نیکی کا بڑا قادر دان ہے، بڑا علم والا ہے، لیکن ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اس سے عمرہ مراد لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حج تو فرض ہے، لیکن عمرہ کسی پر بھی واجب یا فرض نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ

جو لوگ اخفا کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کو) ہادی ہیں بعد اسکے کہ

مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ

ہم ان کو کتاب (الہی توراہ و انجیل) میں عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہیں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور (دوسرے بہترے) لعنت کرنے والے

اللَّعْنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّاهُ لَكَ أَتُوبُ

بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں مگر جو لوگ توبہ کر لیں اور اصلاح کر دیں اور (ان مضامین کو) ظاہر کر دیں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ

عَلَيْهِمْ ۝ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

ہو جاتا ہوں اور میری توبہ بکثرت عادت ہے توبہ قبول کر لینا اور مہربانی فرمانا

حق چھپانے والوں کا حشر

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ

یہود و نصاریٰ ہیں جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں حق کو چھپایا اور آپ کی اتباع نہیں کی، حالاں کہ ان کی کتابوں تورات و انجیل میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق واضح طور پر لکھا ہوا موجود تھا، آپ کی نبوت کی تصدیق اور آپ کی اتباع کے حکم کے ساتھ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنو سلمہ کے معاذ بن جبل، بنو عبدالاشہل کے سعد بن معاذ اور بنو الحارث بن خزرج کے خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم نے چند علماء یہود سے تورات کے بعض مضامین کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتانے سے انکار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مجاہد، ربیع قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہم سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے کہ آیت علماء اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی، جن کی کتاب تورات و انجیل میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق موجود تھی، لیکن پھر بھی وہ انکار کرتے تھے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت

میں ہے کہ ایک یہودی ایک انصاری صحابیؓ کا دوست تھا۔ انھوں نے جب یہودی سے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ کیا تمہارے یہاں آپ کے متعلق کچھ لکھا ہوا ہے تو اس نے انکار کیا، اس پر آیت نازل ہوئی۔ ”مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاكَ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ“ (بعد اس کے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے کتابِ اہل میں کھول چکے ہیں)۔ ”لِلنَّاسِ“ سے مراد ”بَعْضُ النَّاسِ“ (بعض لوگ) ہیں، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، آپ کی بعثت اور آپ کی صفات کا علم اہل کتاب کے سوا اور کسی کو نہیں تھا، آیت میں ”لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ“ سے مراد بھی اہل کتاب اور ان کی کتابیں تورات و انجیل ہی ہیں۔ آیت اگرچہ مخصوص لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے حکم میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جو ایسی بات کو چھپاتے ہوں جس کا لوگوں کے سامنے بیان ان پر فرض ہو۔ اس مضمون کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، آپ نے فرمایا کہ جس شخص سے کسی ایسے علم کے متعلق پوچھا گیا جسے وہ جانتا تھا اور اس کے باوجود اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن آگ کی لگام اس کے منہ میں لگائی جائے گی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر قرآن مجید میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں تم سے کوئی حدیث نہ بیان کرتا، ایک یہی اور دوسری اسی مضمون کی آیت جو دوسرے موقع پر آئی ہے

”وَأُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ“ یعنی ”یہی لوگ“ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حق اس کے باوجود چھپاتے ہیں کہ انھیں اس کے ظاہر کرنے کا حکم ہے، ان کے اس چھپانے کی وجہ سے ”اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں“۔ ”لَعْنَةُ اللَّهِ“ سے نکلا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا لعنت کا اصل مفہوم ہٹا دینا، دور کر دینا ہے۔ اس طرح آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ”یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، اور لعنت کرنے والے بھی اپنے رب سے یہ دعائیں لگتے رہتے ہیں کہ اے اللہ، انھیں اپنی رحمت سے دور کر دے“۔ ”لعنت کرنے والوں کی لعنت“ کا ہم نے جو یہ مفہوم بتایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں اپنی رحمت سے دور کر، تو اس کا ثبوت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ملتا ہے۔ آپ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب قحط پڑتا ہے تو چوپائے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ بنی آدم کے گنہگاروں کی وجہ سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ان پر۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیت میں ”الَّاعِنُونَ“ سے کون لوگ مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مراد زمین کے چوپائے، کیرے کلوڑے اور بچھو وغیرہ ہیں، یہ کہتے ہیں کہ بنی آدم کے گناہوں کی وجہ سے ہم بوند کو ترس رہے ہیں۔ مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما سے یہی قول منقول ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ بہائم یا کسی بھی غیر بنی آدم کی جمع یا اور نون یا واؤ اور نون کے ساتھ نہیں آتی، لیکن ”الَّاعِنُونَ“ میں جمع واؤ اور نون کے ساتھ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد بہائم یا چوپائے وغیرہ نہیں ہیں۔ لیکن اہل عرب بہت سے مواقع پر، جبکہ انسانی صفات کی طرف اشارہ ہو رہا ہو، نہ صرف جمع میں، بلکہ عام خطاب میں وہ الفاظ اور صیغے استعمال کرتے ہیں۔ صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً ”وَقَالُوا اجْلُودِيهِمْ لَهُمْ شُهَدَاءُ عَلَيْنَا“ (اور وہ لوگ اپنی اپنی جلد سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے دی) ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ ادْخُلُوا مَسَاجِدَكُمْ“ (اے چوپائے! اپنے سوراخوں میں جا گھسو)۔ یہی صورت ”الَّاعِنُونَ“ میں بھی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ملائکہ اور مؤمنین ہیں۔ قاعدہ اور ربیع بن انس رحمہما اللہ سے اس کی روایت ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں کے سوا تمام مخلوق مراد ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے برابر بن غازی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ کافر کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو ایک جانور اس کے پاس آتا ہے، اس کی آنکھیں شعلہ برسا رہی ہوتی ہیں، اس کے ہاتھ میں لوہے کا

ڈنڈا ہوتا ہے، اس سے وہ کافر کے دونوں مونڈھوں کے درمیان میں مارتا ہے، اس وقت مردہ کی جو حج نکلتی ہے اسے انسانوں اور جنوں کے سوا اللہ کی تمام مخلوق سنتی ہے، اور جو سنتا ہے اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ ضحاک سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے۔ ہمارے نزدیک ان تمام اقوال میں بہتر قول یہ ہے کہ ”لا عنون“ سے مراد ملائکہ اور مؤمنین ہیں۔ کفار کے ذکر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ جو لوگ کفر کرتے ہیں اور پھر کفر ہی کی حالت میں مرجاتے ہیں تو ان پر اللہ کی فرشتوں کی، اور تمام لوگوں کی لعنت ہوتی ہے۔“ اس لیے زیر تفسیر آیت میں بھی ”لعنت کرنے والوں“ سے مراد انھیں ہی لیا جانا بہتر ہے۔

”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُّوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ“، والبتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور درست ہو جائیں اور ظاہر کر دیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ میں ان پر متوجہ ہو جاؤں گا رحمت سے اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں، بڑا رحمت والا ہوں) یعنی اللہ اور لعنت کرنے والے ان لوگوں پر لعنت کرتے ہیں جو لوگوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی دوسری صفات کے بارے میں حق کو چھپاتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں میں سے کوئی چھپانے سے باز آجائے اور توبہ کر کے آن حضور پر ایمان لائے، آپ کی نبوت و شریعت کی تصدیق کرے اور اللہ کی رضا کے مطابق اچھے اعمال کر کے اپنا حال ٹھیک کر لے اور جو کچھ اسے اپنی آسمانی کتابوں کے ذریعہ آن حضور کے متعلق معلوم ہے اسے سب کے سامنے بیان کر دے اور کوئی بات چھپائے نہ رکھے، تو یقیناً میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کروں گا اور انھیں اہل ایمان اور اپنے طاعت گزار بندوں میں بنا دوں گا۔ پھر ارشاد ہے کہ ”اور میں ہی ہوں جو اپنے بندوں کے اپنی طرف سے پھرے ہوئے دلوں کو دوبارہ اپنی طرف لوٹا لیتا ہوں، اور وہ میری محبت کے طالب ہو جاتے ہیں اور میں رحم کرنے والا ہوں، کہ جب وہ میری طرف واپس آتے ہیں تو انھیں معاف کر دیتا ہوں۔ اسی کے مطابق تفسیر قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے منقول ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ آیت میں ”بَيَّنُّوا“ (اور ظاہر کر دیں) کا مطلب یہ ہے کہ اپنی توبہ کو خاصانہ عمل کے ذریعہ ثابت کر دیں۔ لیکن آیت سے جو مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے، یہ اس کے خلاف ہے۔ آیت میں ذکر اہل کتاب کے حق کو چھپانے کا چلا آ رہا ہے، اور پھر انھیں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں اور حق کو ظاہر کر دیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔ آیت میں اخلاص عمل کا ذکر نہیں کہ یہ مراد لیا جاسکے۔ اس آیت سے ..... عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے جیسے دوسرے اہل کتاب مراد ہیں جو اسلام لائے تھے اور ان حضور کی مخلصانہ اتباع کی تھی۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَفَرُوا وَأُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لعنةُ اللَّهِ

البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لادیں اور اسی حالت غیر اسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی

وَالسَّلَاطَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَلِيدِينَ فِيهَا لَا يَخْفَى عَنْهُمْ

اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی بھی سب کی ایسے طور پر برسا کرے گی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں رہیں گے۔ ان سے عذاب ہلکا نہ ہونے

العَذَابِ وَلَا يَنْظُرُونَ ۝ وَاللَّهُمَّ إِنَّا نَسْتَغِيثُكَ وَأَنْتَ أَعْلَمُ الْغُيُوبِ ۝ وَاللَّهُمَّ إِنَّا نَسْتَغِيثُكَ وَأَنْتَ أَعْلَمُ الْغُيُوبِ ۝ وَاللَّهُمَّ إِنَّا نَسْتَغِيثُكَ وَأَنْتَ أَعْلَمُ الْغُيُوبِ ۝

الرَّحِيمِ ۝ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

عبادت کے لائق نہیں (وہی) رحمن اور رحیم ہے۔ بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے بنانے میں

وَالْفَلَكَ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ

اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب بے کر اور (بارش کے) پانی میں جس

السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبِتِّ فِيهَا

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تروتازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے

مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ صَوِّبَ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین آسمان کے

بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

درمیان مقبر اور زمعلق ارتباط ہے دلائل (توحید کے موجود) ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل (سليم) رکھتے ہیں

كُفْرٍ بِرَبِّهِمْ وَاللَّهُ عَالِمُ الْمُجْرِمِينَ ۝

۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ اللَّعْنَةُ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَالِمُ الْمُجْرِمِينَ ۝

کرتے ہیں خواہ وہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہوں، یا مشرکین اور دوسرے مذہب والے، اگر وہ اسی انکار کی حالت میں مرے تو یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے، اللہ نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا، وشتکار دیا، اور ان پر لعنت ہے فرشتوں کی اور آدمیوں، سب کی۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں «وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ» سے مراد تمام انسان نہیں ہیں، بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے مراد ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سب ہی لوگ مراد ہیں، قیامت کے دن کافر کو سب کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور سب اسے لعنت کریں گے۔ چنانچہ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ کافر کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کریں گے، پھر فرشتے لعنت کریں گے اور پھر سب لوگ لعنت کریں گے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ہر شخص ہی یہ کہتا ہے کہ «اللہ ظالم پر لعنت کرے»، اور ہر طرح ہر شخص کی لعنت کافر تک پہنچتی ہے، کیونکہ وہ بھی ظالم، حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ یہ قول سدی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے میرے نزدیک ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے، یعنی یہ کہ تمام لوگ مراد ہیں۔ ہر بنی آدم ظالم پر لعنت بھیجتا ہے، قرآن مجید میں خود اس کا تذکرہ آیا ہے کہ قیامت کے دن کفار کو ان کے پروردگار کے حضور میں پیش کیا جائے گا اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کو جھٹلایا تھا، اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔

۝ إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ الْمُجْرِمِينَ ۝

”خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ“ ”خَالِدِينَ“ اس سے پہلے ”عَلَيْهِمْ“ کی ضمیر سے حال ہے ”فِيهَا“ میں ”هَآ“ کی ضمیر سے لعنت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر کو اللہ، فرشتوں و انسانوں کی لعنت کے نتیجے میں جو جگہ ملے گی (اس میں اسے ہمیشہ رہنا ہوگا)۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل ہوئی ہے۔ ”لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ“ یعنی ان کا عذاب دوا می ہوگا اور اس میں کسی قسم کی تخفیف بھی نہ ہوگی۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت میں یوں ذکر ہوا ہے کہ ”جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ انھیں موت آئے گی اور نہ ان پر سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔“

ایک موقع پر ارشاد ہے کہ ”جب بھی ان کا چمڑا گل جایا کرے گا تو ہم اس کو دوسرے چمڑے سے بدل دیا کریں گے“ ”وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ“ یعنی انھیں عذر معذرت کرنے کی ہمت بھی نہیں دی جائے گی۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔

”وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ ”وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ“ یعنی تمہارا معبود جس کی طاعت و عبادت تمہارے لیے ضروری ہے۔ وہ ایک ہی ہے، اس لیے اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک نہ کرو۔ کیا اتنی موٹی بات بھی تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم معبود واحد کے ساتھ جن چیزوں کو عبادت میں شریک کرتے ہو، وہ بھی تمہاری ہی طرح کی مخلوق ہیں، ان کی جیسی بہت سی دوسری چیزیں موجود ہیں، حالاں کہ معبود اور رب تو وہ ہے جس کا کوئی مثل و نظیر نہیں، وہ یکتا ہے اور ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت (وَاحِدٌ) کے مفہوم کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے مراد یہ ہے کہ اس جیسا، اس کا مثل کوئی نہیں۔ بولتے ہیں ”فَلَانٌ وَاحِدٌ النَّاسِ“ یعنی فلاں کی مثال نہیں، اس جیسا کوئی لوگوں میں نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا مطلب یہ ہے کہ ”اللہ تمام چیزوں میں منفرد اور یکتا ہے، کیونکہ اللہ کسی بھی دوسری چیز میں نہیں سما سکتا اور نہ کوئی دوسری چیز اس میں سما سکتی ہے، وہ منفرد ہے، یکتا ہے۔“ ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ یعنی دونوں جہان کا رب اس کے سوا اور کوئی نہیں، اور بندوں پر اس کے سوا کسی اور کی عبادت ضروری نہیں، بلکہ اس کے سوا تمام موجودات اسی کی مخلوق ہیں اور سب پر اس کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت ضروری ہے، یہ جو تم نے بہت سے دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تو انھیں کوئی قدرت نہیں، نہ نقصان پہنچانے کی اور نہ نفع پہنچانے کی۔

آیت میں اہل شرک کو تنبیہ ہے کہ گمراہی سے باز آجائیں اور اللہ کی طرف رجوع کریں جو تنہا، منفرد اور یکتا ہے۔ آگے کی آیات میں انھیں کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، ارشاد ہے کہ لے مشرکین، اگر تمہیں معلوم نہیں ہے، یا میں نے جو کچھ بتایا کہ تمہارا معبود صرف ایک ہے اس پر تمہیں یقین نہیں، تو پھر تم خود غور و فکر کرو، آسمان و زمین، دن اور رات کا اس سلسل اور ترتیب کے ساتھ آنا جانا کہ اپنے مقررہ حدود سے سر مو تجا وز نہیں کرتے، آسمان پر بادل اور ان کا ڈپانی

دبقیہ حاشیہ صفر گذشتہ کسی متعین گنہگار پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ کسی کو متعین کیے بغیر مطلق صورت میں جائز ہے، مثلاً چور پر لعنت ہے وغیرہ۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ تو من پر لعنت اس کے قتل کے برابر ہے۔ آیت ”وَمَا تَوْأَمَهُمْ نِكَاحًا“ سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں کسی کافر متعین پر بھی لعنت جائز نہیں ہے۔ ”مَا تَوْأَمَهُمْ“ کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ آیت ان کے لیے ہے جن کی موت ہی کفر پر ہو چکی ہو۔ کیونکہ موت سے پہلے کسی کو نہیں معلوم کہ کب وہ ایمان اور عمل صالح اختیار کرے۔

(مترجم)

جو مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور تمام کائنات تمہیں دعوت فکر دیتی ہے، سوچو، کیا تمہارے یہ بُت اور معبود اس کے انتظام و انصرام پر قدرت رکھتے ہیں، کیا وہ ان جیسی کوئی بھی چیز پیدا کر سکتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر غیر اللہ کی عبادت کرنے کیلئے تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

## کائنات کی شہادت

آگے کی آیات ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ“ سے آخر تک کے شان نزول کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ جب آیت ”وَاللَّهُ كَرِيمٌ“ نازل ہوئی اور آن حضور نے اسے صحابہ رضو کو سنایا تو بہت سے مشرکین نے بھی سنا۔ مشرکین اس پر کہنے لگے کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ معبود صرف ایک ہے، ہم تو اسے نہیں مانتے۔ ہمارے خیال میں تو بہت سارے معبود ہیں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، اور بتایا گیا کہ اللہ کی وحدانیت کی یہ دلیل ہے۔ عطار سے روایت ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ”وَاللَّهُ كَرِيمٌ“ مدینہ میں نازل ہوئی تو مکہ کے کفار قریش نے اس پر اعتراضات شروع کر دیے کہ ایک معبود اتنے سارے انسانوں کے لئے کیسے کافی ہو گا۔ ان کے جواب میں یہ آیات ”لِقَوْمٍ يَحْقُلُونَ“ تک نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور کائنات کی دوسری وہ تمام چیزیں جن کا ذکر آیت میں ہوا ہے، وہ ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کے لئے اللہ کی وحدانیت پر واضح اور صاف نشانی ہیں۔ ابوالضحیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”وَاللَّهُ كَرِيمٌ“ جب نازل ہوئی تو مشرکین نے کہا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر کوئی معجزہ دکھا بیٹے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ عطار بن ابی رباح سے بھی اس طرح کی ایک روایت ہے۔ سعید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قریش نے یہودیوں سے پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام کون سے معجزات لائے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ عصا کا اور ید بیضا کا پھر انہوں نے نصارے سے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اللہ کے حکم سے مرنے کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور برص کی بیماری والے کو اور اندھے کو اچھا کر دیا کرتے تھے۔ اب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ صفا پہاڑی ہمارے لئے سونے کی ہو جائے، پھر ہم آپ پر یقین کر لیں گے۔ آن حضور نے اللہ سے اس کے لئے دعا کی۔ لیکن ادھر سے جواب آیا کہ ٹھیک ہے، ان کی خواہش کے مطابق میں صفا پہاڑی سونے کی بنائے دیتا ہوں، لیکن انہوں نے اگر اس کے باوجود انکار کیا تو ان پر ایسا عذاب نازل کروں گا جو ان سے پہلے کسی پر بھی نازل نہ کیا ہو گا۔ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی کہ پھر مجھے حسب معمول اپنی قوم کو تبلیغ ہی کرنے دیجئے، میں انہیں ہر روز دعوت و تبلیغ کیا کروں گا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، اور انہیں بتایا گیا کہ اگر واقعی تمہیں یقین ہی مطلوب ہے تو یہ پوری کائنات اور اس کے تغیرات کی ترتیب و تنظیم یقین کے لئے کافی ہے، کائنات اپنی عظمت اور پہنائی کے ساتھ، ایک چھوٹی سی پہاڑی، صفا، کو سونے کا بنا دینے سے کہیں بڑھ کر کار نامہ ہے اور اگر کوئی سچائی کے ساتھ حق کا طالب ہو تو اس کے یقین کے لئے اس میں پورا پورا سامان موجود ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ آیت کے نازل ہونے کی جو دو وجہیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی ہو سکتی ہے بہر حال آیت کا مفہوم واضح اور صاف ہے۔

”وَإِخْتِلَافِ الدَّلِيلِ وَالْمُتَهَيِّئَاتِ“ یعنی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے اور اسے ایجاد کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف ”خَلْقِ“ کی نسبت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ چیز پہلے سے موجود نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی نمونہ کے اسے پیدا

کیا۔ ”وَ اِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ“ اور رات اور دن کے پے درپے آنے جانے میں ”وَ اِخْتِلَافِ“ خُلوْف سے نکلا ہے، یعنی دونوں میں ہر ایک معینہ ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کی جگہ لیتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ ”وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا“ اور وہ وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنا دیا اس شخص کے لیے جو سمجھنا چاہے یا شکر ادا کرنا چاہے۔ مطلب وہی ہے کہ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات اوتے بدلتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں ”لَيْلٌ“ لَيْلَةٌ کی جمع ہے (یعنی رات)، جیسے تَمْرٌ، تَمْرَةٌ (یعنی کھجور) کی جمع استعمال ہوتی ہے۔ اس کی جمع ”لَيَالِيٌ“ بھی آتی ہے۔ ”نَهَارٌ“ دن کی جمع اہل عرب استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ اسے ”ضَوْءٌ“ (روشنی) کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ہاں ”نَهْرٌ“ اس کی جمع سنی گئی ہے۔ لیکن اگر جمع ہی لانی ہے تو پھر ”اَنْهَرَةٌ“ قیاس کے مطابق ہوگی۔

”وَالْفُلُكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ“ یعنی اور جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں اور لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش ہیں ”الْفُلُكُ“، یعنی خشکی، جہاز۔ واحد جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ”وَمَا اَنْزَلَ اللهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا“ اور اس پانی میں جسے اللہ نے زمین سے اتارا ”مراد بارش کا پانی ہے۔“ پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد جلا اٹھا یا مرد زمین کی زندگی اس پر نباتات اور سبزہ زار کا اگنا اور اس کی تعمیر ہے۔ ”مِثْرٌ“ کی ضمیر سے مراد پانی ہے اور ”بَعْدَ مَوْتِهَا“ میں ”هَا“ کی ضمیر سے مراد ”زمین“ ہے۔ زمین کی موت اس کا اجاڑ اور سبزیوں اور نباتات کا ختم ہو جانا ہے، کہ اسی سے مخلوق روزی حاصل کرتی ہے۔

”وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ“ اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیے۔ بولتے ہیں ”بَثَّ“ الْأَمِيرُ سَرَائِيَاةً“ امیر نے اپنا لشکر پھیلا دیا۔ ”دَابَّةٌ“ کی ضمیر سے مراد زمین ہے۔ ”دَابَّةٌ“ دَبَّتِ الدَّابَّةُ سے اسم فاعل ہے۔ ”دَابَّةٌ“ ہر اس ذی روح کو کہتے ہیں جو اڑنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، بلکہ صرف زمین پر چل سکتا ہو (دَبَّ، یعنی ہاتھوں یا پیروں کے بل چلنا یا رینگنا)۔ ”وَتَصْرِيفِ الرِّيَّاحِ“ اور ہواؤں کے بدلنے میں ”مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہواؤں کے بدلنے میں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہی ہوا جو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے، جب وہ چاہتا ہے تو لوگوں کے لیے اسے عذاب بنا دیتا ہے اور لوگوں پر وہ اللہ کا قہر اور عذاب بن کر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کبھی تو ہوا رحمت بن کر آتی ہے اور کبھی یہی ہوا تباہی و بربادی لاتی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر و توانا ہے۔ بعض اہل عربیت نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ کبھی شمالی ہوا چلتی ہے، کبھی جنوبی، کبھی پھوپھوتی ہے اور کبھی پروا۔ اور یہی ہواؤں کا بدلنا ہے۔ ”وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ“ آیاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ“ سَحَابٌ، سَحَابَةٌ کی جمع ہے، یعنی بادل۔ بادل کو ”سَحَابٌ“ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کا بعض حصہ دوسرے حصے کو کھینچتا ہوا چلتا ہے، بولتے ہیں ”فُلَانٌ يَسْحُبُ ذَيْلَهُ“، یعنی فلاں اپنا دامن کھینچتا ہوا چلتا ہے۔ ”لَا يَاتُ“ یعنی یہ علامتیں اور دلائل ہیں، اس کے کہ ان تمام چیزوں کا خالق اور انھیں عدم سے وجود بخشنے والا ایک ہے ”لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ“، یعنی ان لوگوں کے لیے جو اتنی سمجھ اور عقل رکھتے ہیں کہ کوئی دلیل جب ان کے سامنے آئے تو اس کے دلوں کا وہ ادراک کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح کر دیا ہے کہ دلیل اور حجت صرف انھیں لوگوں کے لیے ہے



جو عقل اور تمیز رکھتے ہیں، کہ یہی طبقہ امر و نہی اور طاعت و عبادت کا مکلف ہے، اور انھیں کو طاعت پر ثواب اور معصیت پر عقاب ہوگا جو لوگ سرے سے عقل و تمیز ہی نہیں رکھتے وہ احکام کے بھی مکلف نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ سب اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کا کوئی ایسا پیدا کرنے والا اور پھر انکا انتظام کرنے والا ضرور ہے جو اپنی کارگیری میں بے نظیر ہے۔ زمین و آسمان کی غیر محدود وسعتیں، پہاڑوں اور سمندوں کے طویل سلسلے، سمندروں میں کشتیوں کا آنا جانا، اور رات اور دن اور پورے نظام کے ساتھ ایک کے پیچھے دوسرے کا آنا اور جانا اللہ کی بے مثل اور بے نظیر ذات پر کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، کوئی نہیں جو ان چیزوں کی مثال پیدا کر دے جو اللہ نے پیدا کی ہیں عام اہل عرب اللہ کی بالا اور برتر ذات کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ بہت سے معبودان باطل کو شریک کرتے تھے، اس لیے جب انھوں نے آیت "اور تمہارا معبود ایک معبود ہے" پر اعتراضات شروع کیے اور کہا کہ ایک ہی معبود کیسے ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ تو بہت سے دوسرے معبود بھی شریک ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انھیں یہیں پکڑا اور پوچھا کہ یہ جو آسمان تمہارے اوپر موجود ہے اور اس پر سورج اور چاند چڑے ہوئے ہیں جن کا آسمان پر اللہ کے حکم سے چلتے رہنا زمین پر تمہاری روزی کے سامان ہیا کرنا ہے، تمہاری کھیتیاں خشک ہو چکی ہوتی ہیں اور پھر ایک دم بادل اٹھتے ہیں اور تمہارے لیے آب حیات بن کر برستے ہیں، طرح طرح کے چوپائے روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں اور تم ان سے مختلف انواع منافع حاصل کرتے ہو، ہوائیں اٹھتی ہیں، کبھی تمہارے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں اور کبھی جب تمہاری نافرمانیاں بڑھ جاتی ہیں تو تم پر عذاب بن کر ہتی ہیں، بادل آسمان و زمین کے درمیان مقید ہیں اور اللہ کے حکم کے بغیر ایک پنچ بھی حرکت نہیں کر سکتے، کیا یہ تمام چیزیں، جن کا تم اپنی زندگی میں ہمیشہ مشاہدہ کرتے ہو، اللہ کے سوا تمہارے بت اور دوسرے معبود بھی پیدا کر سکتے ہیں، اگر ان کے یہ بس سے باہر ہے تو پھر تم انھیں اللہ کے ساتھ عبادت میں آخر کیوں شریک کرتے ہو؟ ان آیات میں اسی مخصوص عقیدہ رکھنے والے طبقہ کو خطاب ہے، جو لوگ سرے سے اللہ ہی کو نہیں مانتے، یا جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مخلوقات کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ رنجوز باللہ معطل ہو گیا اور اب دوسری طاقتیں کائنات پر قابض و متصرف ہیں، ان آیات میں انھیں خطاب نہیں ہے، اگرچہ غور و فکر کی حد تک ہر شخص کے لیے ان میں دعوت موجود ہے اور بہر حال کائنات اپنے پیدا کرنے والے کی قدرت اور اس کی بے مثل اور بے نظیر ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ

اور ایک آدمی وہ (بھی) ہے جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جتنی محبت

اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ

اللہ سے (رکھنا ضروری) ہے اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔ اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی

العَذَابِ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ○ إِذْ

مصیبت کو دیکھتے تو اسکے وقوع میں غور کر کے سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) دہی سخت ہوگا۔

تَبْرَأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا رَأَوْا الْعَذَابَ وَتَقَطَعَتْ

وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے صاف الگ ہو جاویں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور سب عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم نہیں

بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَّبِعُ اللَّهُ

جو تعلقات تھے اس وقت سب قطع ہو جاویں گے اور (جب) یہ تابع لوگ یوں کہنے لگیں گے کہ کسی طرح ہم سب کو ذرا ایک دفعہ (دنیا میں) جانا ملجا تو ہم

كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَلِكَ يَرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۝

بھی ان سے صاف الگ ہو جاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے اللہ تعالیٰ یوں ہی ان کی بد اعمالیوں کو خالی ارمان کر کے انکو دکھلا دینگے

وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝

اور ان کو دوزخ سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا۔

”وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ“ أَنْدَادًا، نِدُّ کی

جمع ہے، یعنی برابر، مثل۔ اس لفظ کی تحقیق ہم پہلے کر آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ”جن لوگوں نے اللہ کے بہت سے شریک بنا رکھے ہیں وہ ان خود ساختہ شرکاء سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے مومنین اللہ سے محبت کرتے ہیں“ پھر ارشاد ہے کہ ”اللہ سے مومنین کی محبت اس سے بہت بڑھی ہوئی ہے جو مشرکین کو اپنے بتوں سے ہے“

”أَنْدَادًا“ سے آیت میں کیا مراد ہے؟، اس سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ قتادہ، تباہ، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ بت اور مشرکین کے دوسرے معبود ہیں جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کیا کرتے تھے۔ ارشاد ہے کہ اپنے ان معبودوں سے وہ ایسی محبت کرتے ہیں جیسے مومنین کو اللہ سے ہے، لیکن اللہ کی محبت میں مومنین ان پر بہت فائق ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ سردار ہیں جن کی تمام مشرکین اللہ کی معصیت میں اطاعت کیا کرتے تھے۔ یہ قول سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوا ہے۔

”وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ“ اہل بدعت اور شام کی عام قرأت میں بجائے ”وَلَوْ يَرَى“ کے ”وَلَوْ تَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا“ ہے، مخاطب کے صیغے کے ساتھ۔

آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کاش، اے محمد! آپ ان لوگوں کو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور کفر کا راستہ اختیار کیا، اس وقت دیکھتے جب وہ اللہ کے عذاب کا مشاہدہ کریں گے۔ یعنی آپ دیکھتے کہ اس عالم میں وہ کس طرح اللہ کی ربوبیت اور وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں۔ اس صورت میں ”وَلَوْ“ کا جواب چھوڑ دیا گیا، کیونکہ آیت سے خود واضح تھا۔ اس صورت میں یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ ”پھر آپ کو بھی اللہ کے عذاب کا اندازہ ہوتا کہ کتنا شدید ہے“ آگے ارشاد ہے کہ بے شک ساری کی ساری قوت

اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کا عذاب بہت ہی سخت ہے۔ یا یہ کہ وہ کہیں گے کہ ساری کی ساری قوت اللہ کے لیے ہے اس قرأت کی بنیاد پر جواب ”وَلَوْ“ کی اور کئی صورتیں ہیں جو مذکورہ بالا مفہوم کے قریب قریب ہی ہیں۔ دوسری قرأت میں

”وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا“ غائب کے صیغہ کے ساتھ ہے مطلب یہ ہوگا کہ ”کاش ظالم وہ عذاب دیکھ لیتے جو اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ ساری کی ساری قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور بلاشبہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔“ یہ مفہوم کو نہ بصرہ اور مکہ کے علماء قرارت کے مطابق ہے۔ میرے نزدیک پہلی قرارت ”وَلَوْ تَرَى“ مخاطب کے ساتھ زیادہ بہتر ہے، اور مفہوم یہ ہوگا ”کاش، آپ ظالموں کو اس وقت دیکھتے جب وہ عذاب الہی کو دیکھ لیں گے، تو اس وقت آپ کے بھی مشاہدہ میں یہ بات آجاتی کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے،“ اس صورت میں ”أَنَّ الْقُوَّةَ“ سے پہلے ”لَرَأَيْتَ“ محذوف مانا جائے گا۔ ”وَلَوْ تَرَى“ مخاطب کے صیغہ کو ہم نے اس لیے ترجیح دی ہے کہ جو لوگ اس عذاب میں مبتلا ہوں گے وہ تو ظاہر ہے کہ اس کا مشاہدہ کریں گے اور اسے چکھیں گے، سوال اگر پیدا ہو سکتا ہے تو دوسروں کے جاننے کا ہو سکتا ہے جو اس سے دور رہیں گے۔ ”إِذْ يَرْوْنَ الْعَذَابَ“ یعنی جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے، مشاہدہ کر لیں گے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ ”الَّذِينَ ظَلَمُوا“ جنہوں نے ظلم کیا، سے وہی لوگ مراد ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا اور جن کے متعلق کہا گیا کہ اپنے جھوٹے معبودوں سے اس طرح محبت رکھتے ہیں جیسے اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے یعنی قیامت کے دن جب وہ میرے عذاب کو دیکھ لیں گے تب انھیں معلوم ہوگا کہ قوت ساری کی ساری میرے ہی لیے ہے اور میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے، اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ ان کے یہ جھوٹے معبود انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اس دن ان ظالموں کی ساری مصیبت کی جڑ انھیں کی پرستش اور عبادت ہوگی۔

”إِذْ تَبَرَّءَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَإِلَى الْعَذَابِ“ رجب مقتدا اور رہنما اپنے مقتدیوں اور پیروں سے الگ ہو جائیں گے، اور وہ عذاب دیکھ لیں گے، آیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ قتادہ، ربیع اور عطاء رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ مراد کفر و شرک کے رہنما اور مقتدا ہیں کہ وہ قیامت کے دن اپنے پیروں اور ان تمام لوگوں سے جنہوں نے ان کی پے روی کی تھی، اپنی برائت اور علیحدگی کا اظہار کریں گے اور سب کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد ”شیاطین“ ہیں جن کی مشرکین اتباع کرتے ہیں، یعنی وہ اپنی اتباع کرنے والے انسانوں سے الگ ہو جائیں گے اور برائت ظاہر کریں گے۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک میں جو لوگ رہ نمائی کا فرض انجام دے رہے تھے، جب وہ اللہ کا عذاب دیکھیں گے تو اپنے پیروں سے برائت ظاہر کریں گے۔ آیت میں کسی طرح کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ تمام وہ لوگ اس میں آجاتے ہیں جو کفر اور گمراہی میں رہ نمائی کا فرض انجام دیتے تھے، کہ جب وہ اللہ کا عذاب دیکھ لیں گے تو پھر اپنی اتباع کرنے والوں سے برائت ظاہر کریں گے اور ان سے الگ ہو جائیں گے، لیکن بہر حال اس سے پہلے کی آیات میں خصوصیت کے ساتھ مشرکین کا ذکر صل رہا تھا، جنہوں نے اللہ کے ساتھ بہت سے شریک بنا رکھے تھے، اس لیے اس آیت میں بھی خصوصی خطاب انھیں سے ہے، اگرچہ آیت اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے عام ہے اور گمراہی کے تمام ہی رہنما اس میں آجاتے ہیں۔

اس سے بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ پچھلی آیت میں ”أَشْدَّٰدًا“ کی تفسیر میں سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح تھا کہ اس سے مراد انسان ہی ہیں، کفر و شرک کے رہ نما، جن کی عام مشرکین اللہ کی مصیبت اور اس کے کفر میں اطاعت کرتے

تھے۔ یعنی مشرکین معصیت اور کفر میں اپنے سرداروں کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جیسے تو منین اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیت میں ان کا یہ قول غلط ہے کہ ”الَّذِينَ اتَّبَعُوا“ سے مراد شیاطین ہیں، کہ وہ اپنی اتباع کرنے والے انسانوں سے قیامت میں برابرت کریں گے، کیونکہ سیاق میں اللہ کے شریک بنانے والوں کا ذکر ہے۔

”وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ“ اور جب ان کے ”اسباب“ ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔ ”اسباب“ کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد دنیا میں سرداروں اور ان کی اقتدار کرنے والوں کا تعلق ہے، کہ قیامت میں جب وہ اللہ کا عذاب دیکھ لیں گے تو ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید تفصیل فرمائی کہ شرم و حیا کے بندھن (اسباب) قیامت میں ٹوٹ جائیں گے اور دنیا کے سعادوں کا جو وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کے لیے کرتے تھے، کوئی پاس و لحاظ نہ رہے گا، بلکہ اس کے بدلہ میں قیامت کے دن وہ باہمی عداوت اور دشمنی کا مظاہرہ کریں گے، ایک دوسرے سے برابرت کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ”اسباب“ سے مراد آیت میں دنیا میں ان کی عزت اور ان کا مرتبہ و منزلت ہے، کہ قیامت میں وہ باقی نہ رہے گی۔ تیسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مراد ”صلہ رحمی“ ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ”اسباب“ سے مراد وہ اعمال ہیں جنہیں یہ لوگ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ یہ قول سدی اور ابن زید رحمہما اللہ سے نقل ہوا ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ قیامت کے دن اہل تقویٰ کو ان کے اعمال کا ایک وثیقہ دیا جائے گا، وہ ان کی نجات کا پروانہ ہوگا لیکن برائے عمل کرنے والوں کو ان کے بُرے اعمال کا وثیقہ ملے گا، وہ ان کے عمل کے سلسلے کے خاتمہ کی نشانی ہوگی اور انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

”اسباب“ سبب کی جمع ہے، اور ہر اس چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز حاصل کی جاسکے۔ راستہ بھی اسی لیے ایک سبب ہے کہ منزل مقصود تک اسی کے ذریعہ پہنچا جاسکتا ہے، اسی لیے رشتہ و دامادی حرمت کا ”سبب“ ہے، و غیر ذلک۔ جب ”سبب“ کا اصل معنی یہ ہے تو زیر تفسیر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کے تمام اسباب اور وسیلے قیامت کے دن ختم ہو جائیں گے۔ آیت میں بھی اس کا ذکر ہے کہ جب عذاب دیکھ لیں گے تو قاتلاً و رشتہ خوار اپنے پیروں سے برابرت ظاہر کرنے لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اس وقت ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ مختلف مقامات پر مختلف آیات میں قیامت کے دن کفار کی بے چارگی کا ذکر ہے کہ ان میں کوئی بھی ایک دوسرے کی مدد کو نہیں آئے گا، جو دنیا میں باہم دوست رہے ہوں گے وہ بھی وہاں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، قرابت اور رشتہ داروں کو بھی کوئی نہیں پہچانے گا۔ ایک موقع پر توار شاد ہے کہ قیامت میں انہیں کھڑا کر کے سوال کیا جائے گا کہ آج کیا بات ہے، تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی صرف وعدہ پورا کرنے کے لیے اپنے والد کے بارے میں اللہ رب العزت سے استغفار کریں گے، پھر جب ظاہر ہو جائے گا کہ وہ اللہ کے دشمن ہیں تو اللہ کے حضور میں اس سے برابرت کریں گے۔ یہ تمام چیزیں دنیا کے اسباب میں لوگوں کے دنیاوی مقاصد کے پورا کرنے کا ذریعہ ہیں، لیکن قیامت کے دن کفار کے لیے اس طرح کے تمام ذریعے اور وسیلے منقطع ہو جائیں گے اور کوئی ان کے لیے ”سبب“ نجات نہیں بن سکے گا۔ اور یہی تمام چیزیں آیت میں ”اسباب“ سے مراد ہیں جن کا ایک اجمالی ذکر اوپر کیا گیا اور جو قیامت میں کفار کے لیے کا آہر ہو سکتی تھیں، لیکن ان کے اعمال کی وجہ سے ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔

” وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأُ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّأُوا مِنَّا “ یعنی مقتدین اور اتباع کرنے والے جنہوں نے اللہ کے مقابلہ میں اپنے سرداروں کی اطاعت کی تھی، اللہ کا عذاب دیکھ کر کہیں گے، کاش ہمیں پھر ایک دفعہ جانے کا موقع مل جاتا ” کَرَّةً “ سے مراد دنیا کی طرف واپسی ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر نقل ہوئی ہے، یعنی ” ہمیں اگر دنیا میں ایک دفعہ پھر جانے کا موقع مل جائے تو ہم بھی ان سے الگ ہو جائیں، جیسے اب یہ ہم سے الگ ہو گئے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اب اتباع کرنے والے اور مقتدی علیحدگی کی خواہش کا اظہار کریں گے کہ اگر انھیں دنیا میں دوبارہ جانے کا موقع دے دیا جائے تو کفر اور گمراہی کے سرداروں سے کامل علیحدگی اختیار کر لیں گے اور اللہ کی آیات اور اس کے رسول کی تکذیب نہیں کریں گے لیکن اب پانی سر سے گزر چکا ہوگا، عذاب ان کے سامنے ہوگا اور ان کی یہ خواہش پوری نہیں کی جائے گی۔

” كَذٰلِكَ يَرٰبِهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ “ اسی طرح اللہ انھیں ان کے اعمال خالی حسرت کر کے دکھائے گا یعنی جس طرح اللہ قیامت کے دن انھیں عذاب دکھائے گا، اسی طرح ان کے بے اعمال حسرت اور ندامت بن کر ان کے سامنے آئیں گے اور انھیں ان پر سزا ملے گی۔ ” حَسَرَاتٍ “ کی جمع ہے یعنی ندامت۔ کہا جاتا ہے کہ ” حَسْرَةٌ “ ندامت کا انتہائی درجہ ہے۔ آیت کے مفہوم کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔

ایک قول کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ ” جو اعمال ان پر دنیا میں فرض تھے، لیکن ان پر انھوں نے عمل نہیں کیا، بلکہ ضائع کر دیا، اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق عمل کرتے تو انھیں آخرت میں جنت اور اس کی نعمتیں حاصل ہوتیں، وہ دوسرے لوگوں کو دیکھیں گے جنہوں نے اللہ کے احکام پر عمل کیا ہوگا کہ انھیں وہ تمام نعمتیں حاصل ہیں جو اللہ نے اپنے فرمانبردار بندوں کیلئے تیار کر رکھی ہیں اور جن کا اللہ کی طرف سے پہلے سے وعدہ تھا، اس وقت ان کا حشر ان کے سامنے ہوگا اور انھیں حسرت و ندامت کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا وہ سوچیں گے کہ اگر انھوں نے بھی دنیا میں کچھ کر لیا ہوتا اور اللہ کی نافرمانی سے باز آجاتے تو ان کا آج یہ حشر نہ ہوتا، ” سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن جنت کافروں کے سامنے کر دی جائے گی اور وہ اس کے محلات کو دیکھیں گے، اس وقت انھیں اپنی دنیا کی زندگی پر حسرت و ندامت ہوگی کہ کاش، اگر انھوں نے دنیا میں اللہ کی اطاعت کی ہوتی تو انھیں بھی ان نعمتوں سے نوازاجاتا۔ یہی وقت ان کی ندامت کا ہوگا۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ کے سلسلے میں روایت ہے کہ قیامت میں ہر شخص جنت اور دوزخ کے گھروں کو دیکھے گا۔ یہی حسرت کا دن ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ” یہی جب جنتیوں کو دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ کاش، تم نے بھی ان کے جیسے اعمال کیے ہوتے۔ اس وقت انھیں حسرت ہوگی۔ اسی طرح جب جنتی جہنم کو دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اگر اللہ کا احسان تم پر نہ ہوتا تو تم بھی نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے۔ سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جو عمل انھوں نے سرے سے کیا ہی نہیں وہ انھیں کس طرح حسرت و ندامت کر کے دکھایا جائے گا؟۔ انھوں نے تو تمام اعمال بُرے کیے، پھر ان کی طرف نیک اعمال کی نسبت کیسے کر دی گئی، جو انھیں قیامت کے دن حسرت کر کے دکھائے جائیں گے؟ اس سوال کا حل یہ ہے کہ جب ایک شخص کے سامنے ایک کام رکھا جائے تو اس پر عمل سے پہلے بھی اس کی طرف نسبت کی جاسکتی اور کہا جاسکتا ہے کہ ” یہ تمہارا کام ہے، ” مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تمہارا وہ کام ہے جو تمہیں کرنا ہوگا۔ کسی کے سامنے دو پہر کا کھانا رکھا گیا، تو کھانے سے بھی پہلے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمہارا دو پہر کا کھانا ہے۔ آیت میں بھی یہی صورت ہے کہ جو اعمال ان پر ضروری قرار دیئے گئے تھے وہ انھیں حسرت کر کے دکھائے جائیں گے یعنی ان کے نہ کرنے پر انھیں حسرت و ندامت ہوگی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”ان کے بُرے اعمال اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کے دن حسرت کر کے دکھائیں گے، یعنی قیامت میں انہیں حسرت و ندامت ہوگی کہ انہوں نے کیوں اس طرح کے اعمال کیے، کیوں نہ انہوں نے وہ اعمال کیے جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کا باعث بنتے“ یہ قول ربیع اور ابن زید رحمہما اللہ سے نقل ہوا ہے، اور آیت کی تفسیر میں میرے نزدیک یہی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ آیت کے الفاظ سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کو اگرچہ غلط نہیں کہا جاسکتا، آیت میں اس کی بھی گنجائش ہے، لیکن قرآن کے واضح اور صاف مفہوم کو چھوڑ کر اندر سے بات نکالنے کی کوشش مناسب نہیں ہے۔

”وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ“ اور وہ دوزخ سے کبھی نکلنے نہیں پائیں گے، یعنی وہی لوگ جن کا اوپر ذکر ہوا، اگرچہ وہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر اپنے بُرے اعمال پر بڑی ندامت محسوس کریں گے اور کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں ایک مرتبہ اور جانامل جائے تو وہاں پہنچ کر ہم ضرور اچھے اعمال کریں گے، لیکن اس وقت انہیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائیگی، ان کی ندامت و حسرت اور اللہ کی معصیت سے باز آجانے کے عزم کا اظہار، کوئی چیز انہیں دوزخ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی، اب وہی ان کا ہمیشہ کے لیے ٹھکانا ہے۔ اس آیت میں ایسے لوگوں کی کھلی تردید موجود ہے جو یہ کہتے ہیں کہ کفار پر دوزخ کا عذاب ہمیشہ نہیں ہوگا، بلکہ ایک متعین مدت کے بعد انہیں بھی دوزخ سے نکال دیا جائے گا۔ آیت میں صاف الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ ”وہ دوزخ سے کبھی نہیں نکل پائیں گے“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

لِالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ يَتَّبِعُونَ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

مَتَّعُوا فِي الْأَرْضِ ۝ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

لِالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ يَتَّبِعُونَ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

مَتَّعُوا فِي الْأَرْضِ ۝ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

لِالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ يَتَّبِعُونَ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

مَتَّعُوا فِي الْأَرْضِ ۝ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

لِالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ يَتَّبِعُونَ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

مَتَّعُوا فِي الْأَرْضِ ۝ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

لِالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ يَتَّبِعُونَ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

مَتَّعُوا فِي الْأَرْضِ ۝ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

لِالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ يَتَّبِعُونَ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

## صَدِّكُمْ عَنِّي فَهَرَّا يَعْقِلُونَ ○

(اسی طرح) یہ کفار ہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو کچھ نہیں سمجھتے۔

حلت و حرمت اللہ کے حکم پر موقوف ہے

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا  
خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ“ یعنی اے لوگو، وہ

چیزیں کھاؤ جو میں نے تمہارے لیے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے حلال کی ہیں، ان چیزوں کو بھی حلال سمجھو، جنہیں تم نے از خود میری طرف سے حرمت کے حکم کے بغیر، اپنے اوپر حرام کر لیا ہے، مختلف قسم کے وہ جانور جنہیں تم بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اب ان کا کسی حیثیت سے استعمال تمہارے لیے جائز نہیں، اگر میری طرف سے پہلے سے ان کے متعلق حرمت کا کوئی حکم نہیں تو وہ حرام نہیں ہو سکتے، وہ حلال ہی ہیں۔ اسی طرح جن چیزوں کا کھانا میں نے تمہارے لیے حرام کر دیا ہے وہ تمہارے حلال کرنے سے حلال نہیں ہو سکتے، حرام ہی رہیں گے۔ اور شیطان کے نقش قدم پر چلنا چھوڑ دو، کہ وہ تمہیں ہلاک و برباد کر دے گا۔ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ کی ضمیر سے مراد شیطان ہے، یعنی اے لوگو، شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، اس کی تمہارے ساتھ دشمنی اس سے ظاہر ہے کہ اس نے تمہارے جدا جدا آدم علیہ السلام کو سجدہ سے انکار کیا، اور اس سلسلے میں اللہ کے حکم کی بھی پروا نہیں کی، پھر ان کے پیچھے لگا رہا، اور آخر کار انہیں جنت سے نکال کر چھوڑا۔ اس لیے اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم سمجھ سے کام لو اور اس کے نقش قدم پر نہ چلو، بلکہ میرا بتایا ہو اور راستہ اختیار کرو اور صرف میری حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھو اور میری ہی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام جانو۔ یہ جو تم خود سے اپنے لیے چیزوں کو حرام کر کے حکم کے بغیر، حلال اور حرام کر لیتے ہو، یہ بھی شیطان کی ہی پیروی کا نتیجہ ہے۔ ”حَلَالٌ“ بمعنی آزاد ہے، ”حَلٌّ لَكَ هَذَا الشَّيْءُ“ یعنی تم اس چیز کے استعمال میں آزاد ہو۔ ”طَيِّبٌ“ یعنی پاک، جو نہ نجس ہو نہ حرام۔ ”خُطُوَاتٍ“، خُطْوَةٌ کی جمع ہے ”خُطُوتٌ خُطْوَةٌ وَاحِدَةٌ“ میں ایک قدم چلا، سے ماخوذ ہے، مقصد شیطان کا راستہ اختیار کرنے اور اس کے نقش قدم پر چلنے سے منع کرنا ہے کہ وہ اللہ کی طاعت و بندگی کے خلاف راستہ ہے۔ علماء مفسرین کے ”خُطُوَاتٍ“ کے معنی کے سلسلہ میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ”خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ“ کا مفہوم ”شیطان کا عمل“ نقل ہوا ہے، کہ اس کی اتباع نہ کرو۔ مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے ”خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ“ سے ”شیطان کی نافرمانیاں اور اس کی گمراہیاں“ منقول ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد ”شیطان کی اطاعت“ ہے۔ ابو مجلز رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ ”گناہ کے کاموں میں نذر نہ مانو“۔

آیت کی تفسیر میں یہ تمام اقوال مفہوم و معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں، اور سب کا حاصل ایک ہی ہے کہ شیطان کی پیروی نہ کرو اور اس کے راستے پر نہ چلو۔ لفظ ”خُطُوَاتٍ“ کا جہاں تک تعلق ہے تو جیسا کہ ہم نے اس کی وضاحت بھی کی، خُطْوَةٌ کی جمع ہے اور اس کا اصل معنی ہے ”دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ“، لیکن اس کا استعمال عام ہے اور راستہ اور شمار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مَا تَعْلَمُونَ“ یعنی شیطان تمہیں صرف بُرائی اور گندگی کا حکم دیتا ہے اور اس کا کہ تم اللہ پر ایسی باتیں گھڑ لو جن کا تم علم نہیں رکھتے۔ ”السُّوءُ“ وہ بُرا کام جو نقصان دہ

ہو۔ بولتے ہیں ”یَسُوؤُكَ هَذَا الْأَمْرُ“ یعنی یہ کام تمہیں نقصان دے گا۔ ”الْفَحْشَاءُ“ مصدر ہے، ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا تذکرہ فحش سمجھا جاتا ہو اور جس کا سننا ناگوار ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آیت میں ”وَالسُّوْءُ“ سے مراد اللہ کی نافرمانی ہے۔ اسے ”سوء“ اس لیے کہا گیا کہ اس کا کرنے والا انجام اور عاقبت کے اعتبار سے نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”الْفَحْشَاءُ“ سے مراد زنا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس کا سننا ناگوار ہوتا ہے اور اس کے تذکرہ کو پسند نہیں کیا جاتا۔ سدی رحمہ اللہ سے یہی معنی منقول ہیں۔

”وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں مشرکین عرب بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور ان کا استعمال اپنے لیے حرام سمجھتے تھے، یعنی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی۔ اسی کا ذکر ایک موقع پر صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ ”مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ وَلَكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَكَثُرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ“ (اللہ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو، البتہ جو لوگ کافر ہیں وہی اللہ پر جھوٹ جوڑتے رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔ اس آیت کا بھی مطلب یہی ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ آیت میں مذکور جانور ان کے لیے اللہ نے حرام کیے ہیں سراسر غلط بیانی اور جھوٹ ہے، یہ تو شیطان کے دھوکے میں مبتلا ہیں، اللہ نے انہیں ان کے لیے حلال اور جائز کیا ہے، لیکن وہ اللہ کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں جس کا انہیں علم نہیں ہے۔ ان کی اس گمراہی کی جرّ شیطان کی اتباع اور اس کے احکام کی پے روی ہے، اس معاملے میں وہ اپنے آباء و اجداد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، جیسا کہ آگے کی آیت میں مذکور ہے۔

”وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ كُفُوا بِإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا“ آیت کی تفسیر دو طریقوں سے کی گئی ہے ایک یہ کہ ”إِذَا قِيلَ لَهُمُ“ میں ”لَهُمُ“ کی ضمیر سے اس سے پہلے کی آیت میں مذکور ”اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی شریک بنائے ہوئے ہیں“ ”لوگ“ مراد لیے جاتیں۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔

تفسیر کی دوسری صورت یہ ہے کہ ”لَهُمُ“ کی ضمیر سے مراد وہ لوگ لیے جائیں جن کا ذکر آیت ”اے انسانو، زمین پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ موجود ہے اس میں سے کھاؤ پیو“ میں ہے۔ اس صورت میں پہلے تو لوگوں سے براہ راست خطاب تھا، اب خطاب کے بجائے غائب کے صیغے استعمال کیے گئے، اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کلام عرب میں اور خود قرآن مجید

اسے یہ عرب جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ ”بحیرہ“ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو دس بچے جننی اور آخری نہ ہوتا، اس کا کان چیر کر اسے سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاتا۔ ”سائبہ“ وہ اونٹنی تھی جو کسی دیوتا کے نام پر سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دی جاتی اور اسے چارہ پانی سے نہ روکا جاتا۔ ”وصیلہ“ یہ بھی مادہ بچے جننے والی اونٹنی ہے جسے دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ”سحابی“ نراونٹ کی ایک قسم ہے جسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔



میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ میرے نزدیک آیت کی تفسیر میں یہی آخری صورت زیادہ بہتر ہے۔ پہلی صورت میں آیت کا تسلسل نہیں باقی رہتا، کیونکہ درمیان میں دوسرے معنایں بھی ہیں۔ آخری صورت میں تسلسل بھی باقی رہتا ہے اور دونوں آیتوں میں کوئی فاصلہ بھی نہیں۔

آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب یہود کو اسلام کی دعوت دی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو رافع بن خاریجہ اور خالد بن عوف نے اس کا یہ جواب دیا کہ ہم تو بس اسی راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، کیونکہ وہ ہم سے بہتر تھے اور ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، کہ اگر ان کے باپ دادے عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں، کیا اس صورت میں بھی وہ انھیں کی پے روی کریں گے؟ ”إِذْ يَحْوَا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ“ جو کچھ اللہ نے انہیں ان کی پے روی کرو، یعنی اللہ نے جو احکام اپنی کتاب میں اپنے رسول پر نازل کیے ہیں ان کے مطابق عمل کرو، ان چیزوں کو حلال جانو جنہیں اس نے حلال کیا ہے اور جن چیزوں کو اس نے حرام کر دیا ہے انہیں تم بھی حرام قرار دو۔

”وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الْإِنْتِخِيقِ بِمَا لَا يَسْمَعُونَ إِلَّا دُعَاءَ وَنِدَاءَ“ (اُدو)

## یہودیوں کی مثال

جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے جو کچھ سنتا ہی نہیں، بجز بلانے اور پکارنے کے۔ آیت کے مفہوم کے سلسلے میں جو مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں، ان میں پہلا قول یہ ہے کہ آیت میں کافر کی مثال کم فہمی اور عدم قبولیت میں دی گئی ہے، یعنی اس کی مثال اس جانور جیسی ہے کہ جب اسے پکارا جاتا ہے تو آواز تو وہ سن لیتا ہے، لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ اس سے کہا کیا جا رہا ہے۔ یہی حال کافر کا ہے، اللہ کی کتاب جب اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور اللہ کی وحدانیت کو ماننے کی دعوت دی جاتی ہے تو نا سمجھی کا ثبوت دیتا ہے، اس کے لیے بھی یہ دعوت صرف ایک آواز ہے جس کا کوئی مفہوم نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، ربیع، عطار اور سدی رحمہم اللہ سے اس قول کی روایت ہے۔ ان حضرات کی تفسیر کے مطابق کافروں کی اور انھیں نصیحت کرنے والوں کی مثال چرواہے اور بھینٹ بکریوں سے دی گئی ہے، یعنی جس طرح چرواہے کی آواز کو تو اس کے جانور سن لیتے ہیں، لیکن اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں، یہی حال کافروں کو نصیحت کرنے والوں اور ان کی نصیحت کا ہے، کہ کافر سنتے تو ضرور ہیں لیکن سمجھتے کچھ نہیں۔ نصیحت کرنے والے اور نصیحت کا آیت میں ذکر نہیں، کیونکہ بغیر ذکر کے کلام سے ظاہر ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں کفار کے اپنے معبودوں کو پکارنے کی مثال بیان کی گئی ہے، یعنی کافروں کا اپنے بتوں اور معبودوں کو، جو عقل و فہم سے بالکل عاری ہیں، پکارنا اور ان سے منتیں مانگنا، اس شخص جیسا ہے جو چلا رہا ہو اور بجز بلانے اور پکارنے کے پکارنے والا خود بھی کچھ نہ سمجھتا ہو، یعنی وہ ایک آواز باز گشت ہے جو سنی تو جاسکتی ہے، لیکن سمجھی نہیں جاسکتی۔ یہ تفسیر ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص پہاڑ کے درمیان میں چلا تا ہے تو اس سے ایک آواز باز گشت آتی ہے، اور اسے ”صدی“ کہتے ہیں، ان کافروں کے معبودوں کی مثال بھی ان کے حق میں اس شخص جیسی ہے جس کے پکارنے اور چلانے کا جواب صرف پہاڑ کی آواز باز گشت سے مل جاتا ہے، اور اس کا کوئی نفع نہیں، صرف ایک پکار سنائی دیتی ہے۔ آیت میں ایک اور مطلب کی بھی گنجائش ہے، یعنی یہ کہ ”کافروں کے“

اپنے معبودوں کو جو کچھ نہیں سمجھتے، پکارنے کی مثال بھیڑ کو پکارنے والے چرواہے جیسی ہے، کہ وہ بھی چرواہے کی آواز کو نہیں سمجھتی، البتہ پکارنے والا بلا وجہ ہلکان ہوتا ہے، میرے نزدیک بہتر تفسیر پہلی ہے، جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے۔ اس طرح کی مثالیں قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی موجود ہیں۔ ہم نے یہ تفسیر اس لیے پسند کی کہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور وہ بت پرست نہیں تھے۔ عطار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

”صُمُّ بَكْمٌ عَمَىٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ“ یعنی یہی کفار جن کی مثال اوپر بیان کی گئی ”بہرے ہیں“ کہ حق کو نہیں سنتے، ”گونگے ہیں“ کہ حق قبول نہیں کر سکتے اور نہ ان امور کا اقرار کر سکتے ہیں جن کے اقرار کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور جو ان کے سامنے بالکل صاف اور واضح ہیں۔ اللہ کا حکم تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی صداقت کا لوگوں کے سامنے اعلان کریں، لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔ ”اندھے ہیں“ حق کے راستہ اور ہدایت سے کہ انہیں دکھائی نہیں دیتا۔ آیت کی تفسیر قتادہ، سدی اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے۔ ”فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ“ سورہ کچھ بھی نہیں سمجھتے جیسے کہتے ہیں ”فلاں شخص بہرا ہے، کچھ بھی نہیں سنتا، گونگا ہے کچھ بھی نہیں بول سکتا“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا

اے ایمان والو جو شرع کی رو سے پاک چیزیں تم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے رجو چاہو کھاؤ (قرآن اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو۔ اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف حرام کیلئے مردار کو

اللَّهُ إِنْ كُنْتُمْ رَايَا تَعْبُدُونَ ۝ إِنَّهَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ

اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سبب خزاں کو بھی) اور ایسے جانور کو جو بقصد تقرب (غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) پھر بھی جو شخص

غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ

بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ (قدر حاجت) تجاوز کر نیوالا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ بڑے غفور رحیم

در يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ رَايَا تَعْبُدُونَ“ آیت کی تفسیر میں ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”اے وہ لوگو جنہوں نے

اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی وہ روزی کھاؤ جو ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہے، گو اس سے پہلے تم اسے حرام سمجھتے چلے آ رہے تھے، لیکن اب تمہیں معلوم ہوا کہ وہ تو اللہ کی طرف سے حلال تھی، اور اللہ نے جو تمہیں روزی دی ہے اس پر اس کا اس کی شان کے مطابق شکر ادا کرو، اگر تم واقعی اس کے احکام کے مطابق چلنے والے اور اس کے اطاعت گزار بن رہے ہو تو پھر تمہیں وہ تمام چیزیں کھانی چاہئیں جنہیں تم نے اللہ کے حکم کے بغیر از خود حرام کر لیا تھا، لیکن اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ

مسلمانوں سے خطاب

کی طرف سے حلال تھیں۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ جاہلیت میں مشرکین نے بہت سی چیزوں کو از خود حرام قرار دے لیا تھا، حالانکہ اللہ کی طرف سے انھیں حرام نہیں قرار دیا گیا تھا۔ آیت میں انھیں چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ آگے کی آیت میں ان چیزوں کا ذکر ہے جنہیں واقعی اللہ نے حرام کیا ہے۔

”رَأْسًا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ أَلْمَيْتَةَ وَالِدًا وَلَحْمَ الْخَيْزُرِ وَمَا أَهَلَ بِهِ لِخَيْرِ اللَّهِ“ یعنی اے اللہ پر ایمان لانے والو، جب تک میرا حکم نہ ہو، از خود کوئی چیز اپنے اوپر حرام نہ کرو، بھیرہ اور سائبہ وغیرہ جو تم نے اپنے اوپر از خود حرام کیے ہیں، انھیں کھاؤ، کیونکہ میں نے تم پر سوا مردار، خون، سور کے گوشت اور اپنے سوا دوسرے معبودوں کے لیے نامزد کیے ہوئے جانوروں کے اس طرح کی کوئی چیز حرام نہیں کی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”کھانے کی چیزوں میں جو تم پر اللہ نے حرام کی ہیں وہ صرف مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے لیے نامزد کیے ہوئے جانور ہیں، اس کے سوا دوسری چیزیں نہیں حرام کی گئی ہیں۔“ ”مَا أَهَلَ بِهِ لِخَيْرِ اللَّهِ“ یعنی جو بتوں اور معبودوں کے لیے ذبح کیا گیا ہو یا ان کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو۔ ”أَهَلَ“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ جب عرب کسی بت کے نام پر کوئی جانور ذبح کرنا چاہتے تو اس بت کے لیے جانور کو پہلے سے نامزد کر دیتے اور بلند آواز کے ساتھ اپنے اس ارادے کا اظہار کرتے۔ ”أَهَلَ“ کا اصل مفہوم ہے، ”آواز بلند کرنا“، لیکن بعد میں اسے ہر طرح کے ذبح کے لیے استعمال کرنے لگے، خواہ وہ بتوں کے لیے نامزد کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، بلند آواز کے ساتھ بسم اللہ پڑھی گئی ہو یا نہ پڑھی گئی ہو، ورنہ ”أَهَلَ“ کا اصل مفہوم تو ان کاموں کے لیے آواز بلند کرنا تھا۔ اسی مناسبت سے حج یا عمرہ کے لیے تلبیہ کہنے والے کے لیے ”مُهِلَّ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ بھی بلند آواز سے تلبیہ کہتا ہے، پیدائش کے وقت بچہ کی ہلکی سی چیخ کے لیے بھی ”رَأْسًا تَهْلَالًا“ استعمال کرتے اور بارش کے زین پر گرنے کی آواز کو ”رَأْسًا تَهْلَالًا الْمَطَرِ“ کہتے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، مجاہد، ضحاک اور عطاء رحمہم اللہ ”مَا أَهَلَ بِهِ لِخَيْرِ اللَّهِ“ کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ ”ہر وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ذبح کیا گیا ہو“ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ وہ دفعہ ہے جس پر وہ ذبیحہ جو اہل کفر نے غیر اللہ کے لیے کیا ہو (حرام ہے)، قتادہ نے فرمایا کہ جو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا ہو اور جس پر کسی کا نام نہ لیا گیا ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ”جس پر اللہ کے سوا اور کسی کا نام لیا گیا ہو“ ربیع، ابن زید، عقبہ بن مسلم اور قیس بن رافع رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ مراد وہ جانور ہیں جو مشرکین اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ان کے لیے نامزد کرتے تھے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ یہ جانور اللہ کے نام کا ہے، وہ کہتے تھے کہ یہ جانور فلاں بت کے نام کا ہے اور اسی کی طرف آیت میں اشارہ ہے عقبہ بن مسلم اور قیس بن رافع سے نقل ہے کہ انھوں نے فرمایا، عید کائنات کے موقع پر جب جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور اس موقع پر چروٹی اور گوشت ہدیہ کے طور پر بچھا جاتا ہے، وہ ہمارے لیے حلال ہے، کیونکہ وہ اہل کتاب کا کھانا ہے۔ ”مَا أَهَلَ بِهِ لِخَيْرِ اللَّهِ“ میں جو سیوں، بت پرستوں اور مشرکوں کے ذبیحہ کا ذکر ہوا ہے، کہ اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

”فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ“ یعنی جو شخص بھوک سے مضطر ہو کر ان چیزوں کے کھانے پر مجبور ہو جائے جو حرام ہیں، جیسے مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے لیے نامزد کیے ہوئے جانور، اگر کوئی مجبوری کی ایسی حالت میں پہنچ جائے تو ان حرام چیزوں کے کھانے میں بھی کوئی گناہ نہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس نے کھانے میں وہ

نہ بے حکمی کرنے والا ہو اور نہ حد سے نکل جانے والا ہو۔ ”غَيْرَ بَايَعٍ“ حال ہے۔ ”أَضْطَرُّ“۔ ”ضَرُورَةٌ“ سے اقتال کا صیغہ ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”فَمِنْ اضْطَرِّ“ کا مفہوم یہ ہے کہ زبردستی کے مجبور کر دیا گیا اور پھر کھالیا تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل ہے، یعنی کسی کو اس کے کسی دشمن نے پکڑ کر اللہ کی معصیت پر مجبور کر دیا۔ ”غَيْرَ بَايَعٍ وَلَا عَاِدٍ“ کے مفہوم کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ بغیر کسی ظلم کے امت اور حکمراں کے خلاف بغاوت کے لیے نکلنے والا نہ ہو ”وَلَا عَاِدٍ“ یعنی اللہ کی معصیت کے لیے نکلنے والا، فساد اور لڑائی کے ذریعہ مسلمانوں کے راستوں کو پرخطر بنانے والا اور ظلم کرنے والا نہ ہو، یعنی اگر ان کاموں کے لیے وہ نکلا اور پھر حالات نے مجبور کر دیا، فاقوں سے جان کے لالے پڑ گئے اور حرام غذا کے سوا اور کوئی چیز کھانے کے لیے نہیں تو آیت میں مذکورہ اجازت کے حکم سے ایسا شخص خارج ہے، اس پر اس حالت میں بھی حرام کھانے اور حرام مشروبات حرام ہی رہیں گی لیکن اگر کوئی شخص ان بڑے کاموں میں نہیں مبتلا ہے اور اس پر مجبوری اور بے بسی کا وقت آپڑتا ہے تو وہ بھوک اور پیاس کی حالت میں کھانے پینے کی حرام چیزیں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ مجاہد اور سعید رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہوا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”غَيْرَ بَايَعٍ وَلَا عَاِدٍ“ یعنی اس کھانے میں اس کا مقصد طلب حرام نہ ہو، اور نہ کھانے میں اس حد سے تجاوز نہ کرے، جس کی اس کے لیے اجازت ہے۔ قتادہ، حسن، عکرمہ، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے تیسرا قول یہ ہے کہ کھانے میں طلب لذت اور کھانے والے کی نفسانی خواہش کو دخل نہ ہو، اور نہ ضرورت سے زیادہ کھائے، ”سُئِلَ رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ“ سے یہ قول نقل ہے، آپ نے فرمایا کہ حرام کھانے سے پیٹ نہ بھرنا چاہیے، بلکہ صرف اتنا کھانا چاہیے کہ زندگی کی ضروریات کے لیے کام کر سکے۔

بہتر تفسیر آیت کی میرے نزدیک یہ ہے کہ ”غَيْرَ بَايَعٍ“ یعنی مقصد طلب حرام نہ ہو، ”وَلَا عَاِدٍ“ اور نہ اس کھانے میں حد سے تجاوز کرنے والا ہو، یعنی اگر کھانے کی کوئی حلال چیز موجود ہے تو حرام کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو خود کشی اور اپنی جان ضائع کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگر کوئی شخص گناہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے، اس کا مقصد انام حق کے خلاف بغاوت ہے، یا راستوں پر ڈاکے وغیرہ ڈالتا ہے تو یقیناً یہ سب کام گناہ ہیں اور ان کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہے، لیکن بہر حال حکم اب بھی اس کے لیے باقی ہے کہ اپنی جان کر جان بوجھ کر ہلاکت میں نہ ڈالے، اگر پھر بھی وہ خود کو ہلاک کرتا ہے تو وہ دوسرے جرم کا مجرم ہے۔ اس لیے جس طرح دوسروں کو حرام کھانا بحالت اضطرار کھانا چاہیے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ بحالت اضطرار حدود کے اندر رہتے ہوئے حرام کھانے کا استعمال کرے۔ آخری تفسیر کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہماری پسندیدہ دوسری تفسیر کے مفہوم میں یہ بھی آجاتی ہے۔ ”فَلَا تَقْرَبُوا حُرْمَةَ اللَّهِ“

یعنی اگر مذکورہ بالا حالات میں کوئی شخص حدود کی رعایت کرتے ہوئے کھاتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ ”رَأَى اللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں، کہ اگر تم نے خلوص کے ساتھ، جاہلیت کے راستے کو چھوڑ کر، صرف اللہ کی حرام کی ہوتی چیزوں کو حرام جانا تو وہ تمہارے پچھلے تمام گناہ معاف کر دے گا، اور وہ تم پر بڑا رحم کرنے والا ہے کہ اس نے تمہیں مجبوری اور اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی بھی اجازت دی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيُسْتَرُونَ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کا بھیجی ہوئی کتاب رکے مضامین کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں دنیا کا

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ

سناخ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ کے انگارے بھر رہے ہیں

وَلَا يَكْتُمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ توفیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ گناہ معاف کرے انکی صفائی کریں گے اور ان کو نزلے دنان ہوگی

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابَ بِالْغَفْرَةِ

یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سزا پر لیا)

فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَلِكُمْ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ

سو دوزخ کے لیے کیسے باہمت ہیں یہ (ساری مذکورہ سزائیں ان کو اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو بھیجا

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝

ٹھیک بھیجا تھا اور جو لوگ (ایسی) کتاب میں بے راہی کریں وہ بڑے دور کے خلاف میں ہوں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيُسْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا

ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے معاملہ کو چھپایا تھا، حالانکہ اس حضور کے متعلق ان کی آسمانی

کتاب تورات میں لکھا ہوا موجود تھا۔ قنادہ، ربیع، سدیی اور عکرہ رحمہم اللہ سے یہی منقول ہے کہ مراد اہل کتاب ہیں۔ "يُسْتَرُونَ

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا" یعنی آل حضور کی نبوت اور آپ کی صداقت کو معمولی معاوضہ کے بدلہ میں چھپاتے ہیں اور دنیا کی معمولی پونجی

کے پیچھے اتنا بڑا جرم کر گزرتے ہیں۔ اسی مضمون کی آیت اس سے پہلے بھی گذر چکی ہے اور وہاں ہم نے تفصیلات لکھی ہیں۔

وَأُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

یعنی یہ لوگ جو اس حضور کی نبوت کو معمولی معاوضہ کے بدلہ میں چھپاتے ہیں اور اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے

پیٹ میں بس آگ بھرتے ہیں، یعنی اللہ کی کتاب میں تبدیلی کے بدلہ میں جو معاوضہ انہیں ملتا ہے وہی انہیں جہنم میں داخل کرے گا۔

ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ "وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" اللہ ان سے قیامت کے دن کلام نہ کرے گا،

یعنی ایسا کلام نہیں کرے گا جو انہیں پسند ہوگا یا جس کی انہیں آرزو ہوگی، لیکن انہیں سزا دینے کے لیے یا ایسا کلام جو انہیں پسند

ہو، کرے گا۔ قرآن کی آیات سے یہ ثابت ہے کہ اللہ ان سے بھی کلام کرے گا لیکن وہ جو ان کی خواہش اور آرزو کے خلاف

ہوگا۔ "لَا يُزَكِّيهِمْ" یعنی ان کے گناہوں اور ان کے کفر سے "انہیں پاک نہیں کرے گا"۔ "وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ"

اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

”أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالتَّغْفِيرِ“ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں خرید لیا ہے۔ یعنی ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کر لی ہے، وہ راستہ چھوڑ دیا جو اللہ کی مغفرت و رضوان کا باعث بنا، اس کے بجائے وہ راستہ اختیار کیا جو اس کے غضب اور عذاب کو دعوت دیتا ہے۔

”فَمَا أَصْبَرَهُ عَلَى النَّارِ“ اور یہ لوگ کسی جیوٹ رکھتے ہیں دوزخ کے لیے، اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ ”اور ان لوگوں کو ایسے اعمال کرنے کی جو انہیں دوزخ کی طرف لے جا رہے ہیں کیسی جرأت ہو گئی ہے“ قنادہ حسن اور ترمذی اور مجاہد یا سعید بن جبیر سے اس کی روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”انہیں اہل دوزخ کے اعمال کرنے پر کس چیز نے آمادہ کر رکھا ہے“۔ یہ قول بھی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔ ”فَمَا“ میں جو ”مَا“ ہے اس کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ استفہام (سوال) کے لیے ہے، یعنی دوزخ کے لیے انہیں کس چیز نے آمادہ صبر کر رکھا ہے؟۔ مجاہد، سدی، عطاء، ابو بکر بن عیاش اور ابن زبیر رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ”مَا“ تعجب اور اظہار حیرت کے لیے ہے، یعنی دوزخ کے لیے یہ لوگ کیسی جیوٹ رکھتے ہیں، ان میں کیسی دے جا، جرأت ہے کہ دوزخوں کے کام کرنے سے باز نہیں آتے!۔ مجاہد، حسن اور قنادہ کا یہی قول ہے۔ آیت کا تعلق انہیں لوگوں سے ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خریدی ہے، یعنی یہ لوگ ایسے اعمال سے باز نہیں آتے جو انہیں صاف طور پر دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں، ذرا ان کی جرأت تو دیکھو!۔ جن لوگوں نے ”مَا“ کو استفہام کے معنی میں لیا ہے ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ”دوزخ میں تو کسی کو صبر نہیں ہو سکتا، انہیں کس چیز نے دوزخ کے لیے آمادہ صبر کر دیا ہے کہ جان بوجھ کر اہل دوزخ کے اعمال کیے جا رہے ہیں، اور اللہ کی مغفرت کے بدلہ میں وہ راستہ اختیار کر رکھا ہے جو اس کے عذاب کی طرف انہیں لے جا رہا ہے؟۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر پہلی ہے یعنی ”انہیں دوزخوں کے اعمال کرنے کی کیسی جرأت ہو گئی ہے“ اہل عرب بولتے ہیں ”مَا أَصْبَرَ فُلَانٌ عَلَى اللَّهِ“ یعنی فلاں کو اللہ کے مقابلہ میں کیسی جرأت ہو گئی ہے۔ تعجب اور حیرت کے اظہار کی وجہ سے ہے کہ انہیں (یہودیوں کو) سب کچھ ان کی کتابوں کے ذریعہ سے معلوم ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے یہ اعمال انہیں جہنم میں لے جائیں گے، لیکن اس کے باوجود باز نہیں آتے۔

”ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اٰخْتَلَفُوْا فِی الْكِتَابِ لَفِی شِقَاقٍ بَعِیْدٍ رَاوِدٌ بِهٖ اَسْأَلُ“ ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا، اور بے شک جو لوگ کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال رہے ہیں وہ بڑے دور دراز کے خلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔ ”بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ“ کی تفسیر میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات

لے قومی اخلاق میں جب زوال آجاتا ہے اور ایمان صرف برے نام باقی رہ جاتا ہے تو عملی زندگی کا یوں ہی جنازہ نکل جاتا ہے۔ یہود اس زمانہ میں اخلاقی زوال کے آخری اسٹیج پہنچ چکے تھے اور اپنی عملی زندگی کے گناؤں نے پن کا احساس بھی ان میں باقی نہیں رہا تھا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ایمانی و اخلاقی زوال اگرچہ اس درجہ کا تو ہرگز نہیں، لیکن بہر حال دونوں میں ماہہ الا شترک اتنی بات ضرور ہے کہ ہم بھی یہ جانتے ہوئے کہ گناہ اللہ کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا باعث ہے، اس کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔ یہودی اپنے ایمانی و اخلاقی زوال میں اس سے بہت آگے نھے اور اللہ اور اس کے انبیاء کے بارے میں نہایت سنگین جرائم کا ارتکاب بڑی بے حسی کے ساتھ کر جاتے تھے۔ آیت میں ان کی اسی طرح کی مجرمانہ زندگی کی ایک مثال بیان کی گئی ہے (مترجم)۔

نے فرمایا کہ ”ان کا یہ عمل، یعنی حق کو چھپانا اللہ کے احکام کی جان بوجھ کر مخالفت اور اس کے عذاب پر جرأت اس لیے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا“ اشارہ اس آیت کی طرف ہے جس میں آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف طور پر اطلاع دے دی گئی تھی کہ ”جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے حق میں برابر ہے، خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، اللہ نے ان کے دلوں پر جہر لگا دی ہے اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردے ہیں اور ان کے لیے عذاب عظیم مقدر ہو چکا ہے“ ان لوگوں کے متعلق اللہ کی یہ اطلاع ہے جس کی طرف اشارہ اس آیت میں کیا گیا ہے کہ ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے کے سوا اور ان کا کوئی پیشہ نہیں۔ اور یہی وہ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا، کیونکہ ہم نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ منکروں کی سزا دوزخ ہے، اور ان سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ ان کا بھی انجام دوزخ ہی ہے، ”ذَالِکَ“ سے اشارہ اس عذاب کی طرف ہے جو اس سے پہلے کی آیت ”اور یہ لوگ کسی جھوٹ رکھتے ہیں دوزخ کے لیے“ میں ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ”ان پر یہ عذاب ان کے کفر کی وجہ سے ہے یعنی اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری تھی، لیکن انھوں نے اس کا کفر کیا، اور ان پر عذاب اسی کفر کی وجہ سے ہوگا۔ میرے نزدیک ”ذَالِکَ“ سے اشارہ ان تمام ہی امور کی طرف ہے جن کا ذکر ”رَاتَ الَّذِیْنَ یُکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْکِتَابِ“ سے زیر تفسیر آیت تک ہوا ہے اور جن میں یہودی پیشواؤں کی بد عملیوں اور ان پر اللہ کے عذاب کا ذکر ہے، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حق کو چھپانا، دنیا کی معمولی پونجی کے بدلے میں میری کتاب میں تحریف کرنا، میرا ان سے قیامت کے دن کلام نہ کرنا اور ان کے لیے دردناک عذاب تیار رکھنا، یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ میں نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا تھا اور اس کے باوجود انھوں نے اس کا کفر کیا اور اس میں اختلاف کیا۔ ”رَاتَ الَّذِیْنَ اٰخْتَلَفُوْا فِی الْکِتَابِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ“ سے بھی مراد یہود و نصاریٰ ہی ہیں، کہ انھوں نے کتاب اللہ میں اختلاف کیا، چنانچہ یہود نے ان آیات اور واقعات کا انکار کیا جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم اور ان کی والدہ کے بارے میں پہلے ہی بیان کر دیئے تھے، نصاریٰ نے بھی اس کے بعض حصے کی تصدیق کی اور باقی کے وہ بھی منکر ہیں، اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی صداقت کے یہ سب منکر ہیں۔ اسی کے متعلق اس آیت میں بیان ہے کہ اے محمد! یہ لوگ جو اس کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال رہے ہیں جو میں نے آپ پر نازل کی ہے، تو یہ حق کے معاملہ میں دور و راز کے خلاف میں پڑے ہوئے ہیں اور ہدایت سے بہت دور ہیں۔

لَیْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْہَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں دآ گیا کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرو یا مغرب کو

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاسْلَمَتْ وَ الْکِتَابِ

لیکن راصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (سب) کتب (سماویہ)

وَالسَّيِّئِينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ

اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو

وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى

اور (بے خیر) مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ

الزُّكُوٰةَ وَآتَىٰ جَدًّا وَآلًا وَطَرَفًا وَالْمُؤْتَفُونَ عَلَيْهِمْ إِذَا غَدَاةً وَالصَّابِرِينَ

بھی ادا کرتا ہو اور جو شخص (ان عقائد و اعمال کیساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ اپنے عہدوں کو پورا کرے اور جو جب یہاں کر لیں اور لوگ

فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا

مستقل بننے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

اور یہی لوگ ہیں جو سچے (متقی) کہے جاسکتے ہیں

طاعت کیا ہے؟

”لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تَوَلَّوْا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالسَّلَامَةَ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ“ (طاعت یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق

یا مغرب کی طرف پھیر لیا کرو، بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن پورا فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر ایمان

لائے، آیت کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ ”تنہا نماز طاعت نہیں ہے،

بلکہ وہ سب چیزیں طاعت ہیں جن کی تفصیل میں اس آیت میں بیان کروں گا“ گویا اس قول میں ”أَنْ تَوَلَّوْا قِبَلَ الْمَشْرِقِ

وَالْمَغْرِبِ“ سے مراد نماز ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ طاعت یہ نہیں ہے کہ صرف نماز پڑھ لیا کرو اور

دوسرے نیک اعمال کو چھوڑ دو“ یہ آیت ہجرت کے بعد نازل ہوئی، جب فرائض اور حدود بھی نازل ہو گئے تھے، اس لیے

ان پر بھی عمل کا حکم دیا۔ نجا بدرحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ طاعت مغرب یا مشرق کی طرف رخ کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود یہ

ہے کہ اللہ کی طاعت و لوں میں نقش ہو جائے“ ضحاک سے بھی یہی تفسیر روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ ہیں، یہودی مغرب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف

انہیں کے بارے میں اللہ نے یہ آیت نازل کی کہ طاعت کسی خاص سمت کی طرف رخ کرنے میں نہیں بلکہ ان امور میں ہے جن کا

اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے آن حضور صلی اللہ

علیہ وسلم سے ”دبر“ (طاعت) کے بارے میں سوال کیا تھا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ فرائض کے

نازل ہونے سے پہلے صرف اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت نجات کے لیے کافی تھی، پھر یہ آیت

نازل ہوئی اور کہا گیا کہ نجات کے لیے وہ امور ضروری ہیں جن کا ذکر آیت میں ہے۔ یہودی مغرب کی سمت رخ کر کے عبادت



کرتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی سمت کی تقدیس کے قائل تھے۔ میرے نزدیک یہی آخری قول زیادہ مناسب ہے، کیونکہ پہلے ہی سے یہود کا تذکرہ چلا آ رہا ہے، اس لیے یہاں بھی خطاب انھیں سے مراد لینا مناسب ہے، جبکہ ان کے معتقدات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ اے یہود و نصاریٰ! طاعت مشرق یا مغرب کی طرف چہرہ کرنے میں نہیں ہے، بلکہ طاعت نام ہے ایمان صحیح اور عمل صالح کا۔ ”وَلَكِنَّ الْإِدْنَ مِنْ أَمِنَ بِاللَّهِ“ بلکہ طاعت اس شخص کی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے۔ آیت میں ”الِدْنَ“، (طاعت) کے لیے ”مَنْ“، کا استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ ”مَنْ“ انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے، معنی یہ ہوگا کہ ”نیکی وہ شخص ہے“، لیکن عرب میں اس طرح کے کلام کا عام رواج تھا، مثلاً بولتے ”وَأَلْجُودُ حَاتِمٌ“، (سخاوت حاتم ہے) حالانکہ مراد یہ ہوتی کہ ”سخاوت تو حاتم کی سخاوت ہے“ (أَلْجُودُ جُودٌ حَاتِمٌ) وغیرہ۔ یہی صورت آیت میں بھی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”الِدْنَ“ سے مراد ”الْبَارُ“ (طاعت کرنے والا) ہو۔ پھر تو کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

”وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ“ (اور مال کی محبت کے باوجود اسے خرچ کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گروں اور سائلوں پر اور گردنوں (غلاموں) کے آزاد کرنے میں)۔ ”حُبِّهِ“ کی ضمیر سے مراد مال ہے، یعنی مال کی محبت اور اسے اپنے پاس جمع رکھنے کی خواہش ہو، اس کے باوجود اسے خرچ کرے، یہ سمجھ کر کہ اللہ کا حکم ہی ہے اور اس کی رضا اور خوشنودی کے حاصل کرنے کا ذریعہ یہی ہے۔ یہ تفسیر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے پاس شتر مثقال سونا ہے؟ آں حضور نے فرمایا کہ اسے قرابت داروں کو دیدو۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی شخص نے پوچھا کہ کیا آدمی کے مال میں زکات کے سوا اور بھی کوئی حق ہے، جہاں مال خرچ کیا جانا چاہیے، تو آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت کی یعنی آیت میں زکات کے علاوہ نقلی صدقات ہی کی نشان دہی کی گئی ہے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ مال میں زکات کے علاوہ بھی حق ہے، آں حضور نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مال کو، اس سے محبت کے باوجود اپنے قرابت داروں پر خرچ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کم آمدنی کے باوجود آدمی کا اپنے قرابت دار پر خرچ کرنا۔ ”الْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ“ کی تفسیر پہلے گزر چکی۔ ”ابْنِ السَّبِيلِ“ سے مراد مسافر ہے لیکن کس طرح کا مسافر؟ اس کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد ”مہمان“ ہے، آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی کہ جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ کھلی بات زبان سے نکالے ورنہ چپ رہے پھر آپ نے کہا کہ مشہور ہے کہ ہانی کا حق تین دن تک ہے، اس کے بعد صدقہ ہے۔ ابو جعفر اور مجاہد رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ مراد ”عام مسافر“ ہے، یعنی سفر کے دوران میں کسی بستی وغیرہ سے گزرنے والا۔ ”ابْنِ السَّبِيلِ“ سفر کرنے والے کو اس لیے کہتے ہیں کہ سفر کے دوران میں وہ راستے سے نہیں ہٹتا۔ ”ابن“ کے ساتھ اس طرح کا استعمال عرب میں عام اور مروج تھا، پانی کے پرندے کو ”ابْنِ الطَّيْرِ“ کہتے تھے۔ ”السَّائِلِينَ“ سے مراد مانگنے والے ہیں۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے۔ ”فِي الرِّقَابِ“ یعنی گردن آزاد کرانے میں، مراد غلاموں کی آزادی ہے۔ یہ تمام مواقع ہیں جہاں مال کو محبت کے باوجود خرچ کرنا طاعت ہے۔

”وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا“ (اور نماز کی پابندی کرے اور

زکات ادا کرے اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وہ وعدہ کر چکے ہوں۔ ”وَأَقَامَ الصَّلَاةَ“، یعنی نماز کے حدود اور اس کے آداب کی رعایت کے ساتھ اس کی پابندی کرے۔ ”وَأَتَى الزَّكَاةَ“، یعنی اللہ کے فریضہ کے مطابق زکات ادا کرے۔ ”وَالَّذِينَ هُمْ إِذَا مَآءُ دَارِهِمْ جَاءُوا بِكُمْ بِمَوَدَّةٍ وَرَأْفَةٍ“، کا مطلب یہ ہے کہ ”جو معاہدہ کے بعد اللہ کے نام پر کیے ہوئے عہد کو نہیں توڑتے، بلکہ اسے پورا کرتے ہیں“ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے نام پر کسی سے معاہدہ کر کے توڑ دے گا اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لیں گے اور جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر معاہدہ کر کے اسے توڑے گا، اس حضور قیامت کے دن اس پر دعویٰ دار ہوں گے۔

”وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ“ صبر کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”اور تنگی میں اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے“، یعنی اگرچہ خواہش ان چیزوں سے دور رہنے کی ہوتی ہے، کہ ہر شخص کے لیے یہ امور ناگوار ہیں، لیکن وہ ان حالات میں بھی اللہ کی اطاعت پر جمے رہنے والے ہوں اور ان سے گھبرانے والے نہ ہوں۔ ”الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ“ کے کئی معنی مفسرین سے نقل ہوئے ہیں۔ سدی، قتادہ، ضحاک اور ابن جریر رحمہم اللہ سے نقل ہے کہ ”الْبَأْسَاءُ“، فقر اور تنگی کے معنی میں ہے، اور ”الضَّرَّاءُ“، بیماری کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں لفظ اسماء افعال ہیں۔ ”الصَّابِرِينَ“ کو نصب مدح کی وجہ سے ہے، جب کسی کی صفات کا بیان طویل ہو جاتا تو اہل عرب درمیان میں کوئی لفظ مدح یا ذم کے لیے ایسا لاتے جو قاعدہ کی رعایت کے بغیر منسوب یا مرفوع ہوتا۔ یہی صورت یہاں بھی ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کا غطف اس سے پہلے کی آیت کے ”الْمُتَّقِينَ“ پر ہے اور اسی وجہ سے اسے نصب ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ”وَحِينَ الْبَأْسِ“ یعنی ”گھسان کی لڑائی کے وقت“، بھی وہ صبر کرنے والے ہوں۔ یہ قول عبد اللہ رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، ربیع اور ضحاک رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

”أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ“، یعنی یہی لوگ ہیں جو سچے اترے اور یہی لوگ متقی بھی ہیں“ مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور جن کی صفات اوپر کی آیات میں گزریں۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے اترے اور زبان سے جو کچھ کہا اسے عمل سے سچا کر دکھایا، اس کے برعکس وہ لوگ جن کے یہاں ساری اہمیت مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو ہے، اور جو حق اور اللہ کی آیات کو چھپاتے ہیں اور اس کے رسول کو جھٹلاتے ہیں وہ اس معیار پر کسی طرح پورے نہیں اترتے، بلکہ ان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ”وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ“ یعنی یہی ہیں جو اللہ کے عقاب سے ڈرے اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کیا۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”یہی وہ لوگ ہیں جو سچے اترے، یعنی ایمان کا جو کلمہ انہوں نے اپنی زبان سے ادا کیا تھا اسے عمل سے ثابت کر دکھایا جس نے اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”یہ ایمان کا کلمہ ہے اور اس کی حقیقت عمل سے ہے، اگر اس کلمہ کے ساتھ عمل نہ ہو تو پھر کوئی فائدہ نہیں ہوگا“۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ

اے ایمان والو! تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے مقتولین (بقتل عمد) کے بارہ میں

الْحُرِّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدِ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ فَمَنْ عَفِيَ

آزاد آدمی، آزاد آدمی کے عوض میں اور غلام، غلام کے عوض میں اور عورت، عورت کے عوض میں، ہاں جس کو اسکے فریق کی

لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ط

طرف سے کچھ معافی ہو جاوے (مگر پوری معافی نہ ہو) تو (مدعی کے ذمہ) معقول طور پر (خونہا کا) مطالبہ کرنا اور (قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ اس کے پاس

ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن سَائِبِكُمْ وَسَرَّحَةٌ ط فَمِنَ اعْتَدَايِ

پہنچا دینا۔ یہ (قانون ویت و عفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا) میں تخفیف اور (شاہانہ) رحم ہے پھر جو شخص اس کے بعد

بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ ط

تعدی کا مرتکب ہو تو اس شخص کو بڑا دردناک عذاب ہوگا اور فہم لوگوں کو اس قانون (قصاص) میں تمہاری

يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

جانوں کا بڑا بچاؤ ہو، امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (اپسے قانون امن کا خلا و زری کر نیسے) پر ہنر رکھو گے۔

قصاص اور اس سے متعلق احکام

«كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ط الْحَرُّ بِالْحَرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ  
الْأَنْثَى بِالْأُنْثَى» آیت میں «كُتِبَ» کے معنی «فُرِضَ» ہیں،

یعنی تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔ «فوقصاص» (بدلہ) فرض کیا گیا ہے، لیکن مقتول کے ولی و وارث کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے، یعنی اگر وہ چاہے تو معاف بھی کر سکتا ہے، مال کی ایک متعینہ مقدار پر، جسے شریعت میں «دیت» کہتے، قاتل سے مصالحت بھی کر سکتا ہے، گویا اس کے لیے قصاص مباح اور جائز نہ ہوا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ «اے ایمان والو! تم پر یہ مقتول کے باب میں قصاص فرض کیا گیا ہے، آزاد کے بدلہ میں آزاد، غلام کے بدلہ میں غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت» یہاں قصاص کے فرض کیے جانے کا مفہوم یہ ہے کہ آزاد اگر کسی آزاد شخص کو قتل کر دے تو قاتل کا خون مقتول کے خون کے برابر سمجھا جائے گا اور بدلہ صرف قاتل سے لیا جائے گا، قاتل کے سوا کسی بھی غیر متعلق شخص سے بدلہ نہیں لیا جائے گا، کہ بے گناہ کو مجرم بنا لینا حرام ہے۔ قصاص اسی لیے فرض کیا گیا ہے اور اس کے فرض ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ قاتل کے سوا کسی بھی دوسرے شخص سے بدلہ نہ لیا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ «قصاص» بھی ہم پر نماز روزہ کی طرح فرض ہے، کہ اسے چھوڑنا جائز ہی نہ ہو۔ اگر یہی مطلب ہوتا تو اس کے بعد کی آیت «ہاں جسے اس کے فریق مقابل کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے»، کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم نے آیت میں قصاص کے فرض کیے جانے کی وضاحت کی کہ مقصود صرف قاتل ہی سے قصاص لینے کے لیے ہے، اس لیے آیت سے کوئی یہ مفہوم بھی نہ نکلے کہ آزاد صرف آزاد ہی کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا، کیونکہ آیت میں اس مسئلہ کو نہیں چھیڑا گیا ہے، یہ حکم دوسری آیت میں آیا ہے: «مَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيِّهِ سُلْطَانًا»، جو کوئی ناحق قتل کیا جائے سو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دے دیا ہے، اسی طرح آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اتر کے ساتھ یہ حدیث ثابت ہے کہ «ہر مسلمان کا خون دوسرے مسلمان کے خون کے برابر ہے»۔

آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیتیں ایک ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی جن کے کسی فرد کو

اگر دوسری قوم کا غلام قتل کر دیتا تو وہ قاتل کو قتل کرنے کے بجائے قوم کے سردار کے قتل کا مطالبہ کرتے اور اسے ہی قتل کر کے چھوڑتے کیونکہ غلام کو اپنے آزاد کے بدلہ میں قتل کرنے میں وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی عورت ان کی قوم کے کسی مرد کو قتل کر دیتی تو اس عورت کو بدلہ میں قتل نہیں کرتے، بلکہ اس عورت کے قبیلہ کے مرد کو قتل کرتے۔ عرب کے قبائل اپنی جاہلی شرف و عزت کے فرد میں اس طرح کے اقدامات کرتے تھے۔ آیت میں اس سے روکا گیا ہے کہ یہ شیطانی عمل ہے کہ قتل کا بدلہ کسی بے گناہ سے لیا جائے، قاتل بوجھتی ہو صرف وہی مجرم ہے۔ یہ قول قتادہ، شعبی، عامر، مجاہد اور عطاء رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو فریقوں میں، جن میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا کافر، جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا، جنگ ہوئی اور دونوں طرف کے مرد اور عورتیں قتل کی گئیں۔ اس حضور نے انہیں ان کے اصول کے مطابق ان میں صلح کرائی۔ صورت اس کی یہ کہ ہر فریق کی عورتوں کا تاوان دوسرے فریق کی عورتوں کے تاوان کے بدلہ میں رکھا، مردوں کا تاوان دوسرے فریق کے مردوں کے بدلہ میں اور غلاموں کا تاوان دوسرے فریق کے غلاموں کے بدلہ میں۔ آیت میں اسی صورت کا بیان ہے۔ سعدی اور شعبی رحمہما اللہ سے یہ روایت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آیت آزادہ غلام اور مرد اور عورت کے خون بہا دہانی تاوان کی صورت بیان کرنے میں نازل ہوئی یعنی قتل عمد کی صورت میں اگر مقتول کا قاتل سے قصاص لیا گیا اور مقتول قاتل سے کم درجہ کا ہے تو قاتل کے درجہ کی نفعت کے پیش نظر مقتول کے ورثہ کو اسی کے مطابق تاوان دینا پڑے گا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ اگر کسی آزاد نے، مثال کے طور پر کسی غلام کو قتل کر دیا تو اس سے اس کا بدلہ لیا جائے گا، لیکن اگر غلام کے مالک آزاد قاتل کو اس کے بدلہ میں قتل کرنے کا مطالبہ کریں تو انھیں اس کا حق ہے، البتہ اس صورت میں انھیں اپنی تاوان بھی دینا پڑے گا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ قاتل عمد کی صورت میں خون بہا دہانی (آیت) کا جو فرق غلام اور آزاد میں ہے، اس کے پیش نظر غلام کے بدلہ میں اگر آزاد کو قتل کیا گیا تو اتنا مال تاوان غلام کے وارثوں کو قاتل کے وارثوں کو دینا ہوگا جو آزاد کے قتل عمد کی صورت میں ہوتا ہے، البتہ غلام کی قیمت اس میں سے کاٹ لی جائے گی۔ اسی طرح عورت اور مرد کا فرق کیا جائے گا، اگر کسی مقتول عورت کے بدلہ میں قاتل مرد کو مقتولہ کے وارثوں نے قتل کرنے کا مطالبہ کیا تو مرد کے قتل کی صورت میں جو دیت واجب ہوتی، اس کا نصف انھیں مرد کے وارثوں کو دینا ہوگا۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت ہے،

چوتھا قول یہ ہے کہ آیت عرب کے ان قبائل کے بارے میں نازل ہوئی جو مرد کے بدلہ میں مرد ہی کو قتل کرتے تھے، اگر عورت قتل کی جاتی اور قاتل مرد ہوتا تو اسے بدلے میں قتل نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام جانیں برابر ہیں اور خون اور قصاص کے معاملہ میں کسی جنس کو دوسری جنس پر فوقیت نہیں ہے۔ اس حکم کو اور زیادہ صاف اس آیت میں کر دیا گیا ہے کہ وہ اور ہم نے ان پر فرض کیا تھا کہ جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا ناک اور کان کا کان اور دانت کا دانت اور زخموں میں قصاص ہے۔ آیت میں بلا کسی تفریق کے قصاص کے معاملہ میں سب کو ایک سطح پر رکھا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی قول نقل ہوا ہے۔

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں اگرچہ اقوال مختلف ہیں، لیکن بہر حال قبول وہی قول کیا جائے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اس حضور کی احادیث میں جن کی نقل و روایت کی حیثیت بہت مضبوط اور صاف ہے، یہ مضمون واضح طور

پر موجود ہے کہ آزاد عورت کا قصاص آزاد مرد سے لیا جائے گا، اور اس میں کسی قسم کی تفریق نہ ہوگی۔ اس سے منقول یہ قول قبول نہیں ہوگا کہ مرد سے عورت کا قصاص لینے میں، یا آزاد سے غلام کا قصاص لینے میں تفریق کی جائے گی اور اگر اس طرح کی صورتوں میں مقتول کے وارثین جان کا بدلہ جان سے لینے پر مصر ہیں تو انہیں مالی تاوان دینا پڑے گا۔ یہ قول اہل اسلام کے اہل عیال کے خلاف ہے، اور اس لیے ہرگز قابل قبول نہیں۔ اس سے بھی قطع نظر کسی شخص کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ اپنے جسم کا کوئی بھی عضو مالی معاوضہ لے کر ضائع کرے، ایسی کوئی بھی صورت حرام ہے، ظاہر ہے کہ مالی معاوضہ لے کر جان ضائع کرنا تو بہت زور کی بات ہے۔ اسی طرح کسی بھی شخص پر یہ حرام ہے کہ مالی معاوضہ دے کر دوسرے شخص کے بدن کا کوئی حصہ ضائع کرے۔ اس لیے جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جاسکتا ہے تو اسے کمال طور پر قصاص ہی کہا جائے گا۔ آیت میں بھی "غلام کے بدلہ میں غلام، آزاد کے بدلہ میں آزاد عورت کے بدلہ میں عورت" سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ ایک جنس کو اس کی مخالف جنس کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا، اور یہ اب تک کی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے، اس لیے اس کی تفسیر میں دو ہی قول قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مقصود یہ ہے کہ قصاص صرف قاتل ہی سے لیا جائے، قاتل کے سوا دوسرے سے گناہ افراد کو اس میں نہ گھسیٹا جائے، یعنی ایسا نہ کیا جائے کہ قاتل تو کیا عورت لے اور قصاص مرد سے لیا جائے، یا قاتل کیا ہو غلام لے اور بدلہ لیا جائے آزاد سے، جیسا کہ عرب کے بعض قبائل جاہلی نحت کی بنا پر ایسا کرتے تھے۔

دوسرا قول یہ کہ آیت چند قبیلوں کے معاہدہ کے سلسلے میں نازل ہوئی اور اس میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مقتولین کا ایک دوسرے کو مالی معاوضہ دلوا یا تھا، جیسا کہ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول روایت میں اس کی تفصیل گذری۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے، بندوں کے حقوق میں قصاص اور بدلہ لینا واجب و فرض نہیں ہے، بلکہ معاف بھی کیا جاسکتا ہے، اسی طرح خونہا بھی لیا جاسکتا ہے، اس لیے آیت کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اہل حقوق پر مقتول کے باپ میں قصاص لینا فرض کیا گیا ہے، اگر فرض مان لیا جائے پھر تو انہیں معاف کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے، حالانکہ اس پر سبب کا اتفاق ہے کہ مقتول کے وارث معاف بھی کر سکتے ہیں۔ ہم اس کا مفہوم بیان کر چکے ہیں۔ "و کتبت" کے اصل معنی تو لکھنا ہیں، لیکن کلام عرب میں فرض و لازم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اشعار میں اس معنی میں اس لفظ کا استعمال بکثرت ہے۔ میراجیال یہ ہے کہ یہ معنی بھی کتابت ہی سے ماخوذ ہے، جو لکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ "لو ج محفوظ میں تمہارے لیے مقتول کے باپ میں قصاص لکھ دیا گیا ہے، کہ بدلہ میں صرف قاتل ہی قتل کیا جائے، کوئی دوسرا نہ قتل کیا جائے۔" "و القصاص" قاصصت فاکنا، سے ماخوذ ہے، یعنی میں نے فلاں سے اپنے حق کا بدلہ لے لیا جو اس نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ اس میں عمل یکساں ہوتا ہے، اگرچہ ایک طرف سے ظلم ہو گیا ہو اور دوسری طرف سے حق و انصاف ہے۔ قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کرنے میں بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ "و قتلنی" قتل کی جمع ہے، یعنی مقتول۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایمان والوں، مقتول کا قصاص یہ ہے کہ اس کے بدلہ میں قاتل کو قتل کیا جائے، خواہ وہ عورت ہو، غلام ہو یا آزاد ہو۔

مصالحات کے بعد سے اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا مفہوم یہ نقل ہے

کہ دیکھیں کسی کو قتل عمد (قصد و ارادہ کے ساتھ قتل) میں اس کے بھائی یعنی مقتول کے فریق، کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے تو معاف کرنے والے کی طرف سے دیت (خونہا، مالی تاوان) کے مطالبہ میں نرمی اور معقولیت ملحوظ رہنی چاہیے، اور جسے معاف کیا گیا ہے، یعنی قاتل، اس کی طرف سے خونہا کی ادائیگی مناسب طریقہ پر اور خوبی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ قتل عمد میں عدالت کا فیصلہ تو قصاص ہی ہوگا، یعنی قاتل کو اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے، لیکن مقتول کے ورثا اور قاتل میں صلح ہو جائے اور ورثا، مقتول قاتل سے خونہا لے کر اسے معاف کرنے پر تیار ہو جائیں تو عدالت بھی قصاص کا فیصلہ نہیں کرے گی کیونکہ قتل اسلام کی نظر میں قابل راضی نامہ جرم ہے۔ آیت میں ”عَفِيَ“ کا یہی مطلب ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ مقتول کے ورثا، خونہا کے مطالبہ میں نرم خوبی اور معقولیت کا مظاہرہ کریں اور مزید شر و فساد سے پرہیز کریں۔ دوسری طرف یہی ہدایت قاتل کو دی جا رہی ہے کہ وہ خونہا کی ادائیگی ٹھیک طریقہ پر کر دے، غیر مناسب روش نہ اختیار کرے۔ مجاہد، حسن، شعبی، قتادہ، ربیع، ابن جریر اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہی قول نقل ہوا ہے۔ جن حضرات نے ”کِتَابُ عَلْتِكُمْ الْقِصَاصُ“ کا شان نزول یہ بتایا تھا کہ دو فریقوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور انھیں یہ حکم ہوا تھا کہ ہر فریق اپنے فریق مخالف کے مقتولین کی دیت ادا کرے وہ اس آیت کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ ”جس فریق کی دیت اس کے بھائی دوسرے فریق پر زیادہ نکل آئے تو انھیں مطالبہ میں نرمی اختیار کرنی چاہیے، اور جن پر دیت باقی رہ گئی ہے انھیں ادائیگی ٹھیک طرح کر دینی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ان حضرات نے ”عَفُو“ (جس سے عَفِيَ نکلا ہے) کا معنی کثرت لیا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل ہے۔ میرے نزدیک صحیح قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، جو سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ ”فَاتَّبَاعُ بِالْمَعْرُوفِ“ کا مطلب یہ ہے کہ قصاص کی معافی اور صلح کے بعد اللہ نے جو خونہا متعین کر دیا ہے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جائے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خونہا میں ایک اونٹ بھی زیادہ دینا یا زیادتی کا مطالبہ کرنا جاہلیت کے کاموں میں سے ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے ”حسن ادائیگی“ کا یہ مفہوم ہے کہ جو کچھ خونہا کے طور پر اس پر واجب ہے وہ ٹھیک ٹھیک ادا کرے، کسی قسم کی حق تلفی یا ٹال مٹول نہ کرے۔

”ذَالِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكَ وَرَحْمَةٌ“ یعنی یہ جو تمہارے رب نے قتل عمد کی صورت میں قصاص کے علاوہ خونہا کی بھی صورت تمہارے لیے پیدا کر دی ہے، ”یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے تخفیف اور مہربانی ہے“ پچھلی امتوں میں یہ صورت نہیں تھی اور ان پر قتل کے بدلہ میں خونہا لینا حرام تھا، لیکن میں نے اس امت کے لیے اسے جائز کر دیا ہے اور یہ محض میری مہربانی اور میری طرف سے تمہارے لیے رعایت و تخفیف ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور ربیع سے منقول ہے۔

”فَمَنْ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ“ پس جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے گا اس کے لیے دردناک عذاب ہے، یعنی قتل عمد کی صورت میں جو شخص خونہا وصول کرنے کے بعد پھر ظلم کرے اور قاتل کو قتل کر دے تو اس کے اس فعل پر جو میں نے اس کے لیے حرام کیا ہے، اسے دردناک عذاب ملے گا۔ مجاہد، قتادہ، حسن، عکرمہ، سدی، ابن زید رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل ہے۔ قتادہ نے ایک حدیث کی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص خونہا لینے کے بعد قاتل کو قتل کرے گا میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ ”فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ“ کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ ضحاک، سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ ”خونہا لینے کے بعد جس نے قاتل کو قتل کیا

اس کی سزا قتل ہے

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں "عذاب سے مراد وہ سزا ہے جو ایسے شخص کے لیے حاکم تجویز کرے گا، یعنی ایسے شخص کی سزا حاکم کی ثواب دید پر موقوف ہے حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہ صورت نقل ہوئی ہے کہ ایسے شخص سے وہ خونبہا لے لیا جائیگا جو اس نے قاتل سے وصول کیا تھا، اس کے بعد ان کا معاملہ برابر ہو جائے گا۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر یہی ہے، یعنی خونبہا لینے کے بعد پھر اگر قاتل کو قتل کر دیا تو اسی دنیا میں سے دردناک سزا دی جائے گی، اور وہ قتل ہے۔ آیت سے بھی یہی ظاہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا قول علماء امت کے اجماع کی خلاف "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ"۔ "تمہارے لیے، اے اہل عقل و فہم میرے فرض کیے ہوئے قانونِ قصاص میں زندگی ہے، یعنی اگر تم نے اس پر عمل کیا تو پھر کوئی کسی کو قتل کرنے کی جرأت نہیں کرے گا، اور اس طرح ناحق قتل سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی اور تمہاری زندگی امن سے گزرے گی۔ اس میں تمہاری دنیا کی بھی صلاح ہے اور دین کی بھی۔ مجاہد، قتادہ، ربیع، ابن زید اور ابو صالح رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسری تفسیر اس آیت کی عرب جاہلیت کے اس دستور کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے کہ قاتل کو چھوڑ کر بے گناہوں کو اس جرم میں قتل کرتے تھے، قاتل اگر عورت ہے تو اس کے قبیلہ کے کسی مرد کو قتل کرنا باعث شرف و عزت سمجھتے، اگر قاتل غلام ہے تو اسے قتل کرنے میں انھیں اپنی توہین نظر آتی، وہ اس کے بجائے غلام کے مالک کو قتل کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تفسیر یہ ہے کہ "اس قانون میں کہ صرف قاتل سے قصاص لیا جاسکتا ہے تمہارے لیے زندگی ہے، کیونکہ اصل مجرم ہی پکڑا جائے گا، دوسرے افراد جو بے گناہ ہیں، ان کی زندگی محفوظ رہے گی۔ یہ قول سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔ "یا اُولِي الْأَلْبَابِ" یعنی اے اہل عقل و فہم۔ "أَلْبَاب" کلمہ کی جمع ہے، یعنی عقل۔ یہاں خطاب خاص اہل فہم طبقہ سے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و نواہی اور اس کے بنائے ہوئے قانون کی گہرائیوں کو یہی لوگ سمجھ سکتے ہیں اور یہی لوگ اس کی آیات اور اس کی نشانیوں میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ، یعنی ناحق قتل کرنے سے باز آجاؤ، اور اس طرح تمہاری بھی جان محفوظ رہے۔

كِتَبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ

تیرے فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو

وَالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۗ

تو والدین اور اقارب کے لیے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک تہ سے زیادہ نہ ہو) کچھ بتلا جاوے (اس کا نام وصیت) جن کو خدا کا خوف

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا أَشْمَةٌ عَلَى الَّذِينَ يَبَدِّلُونَهُ ۗ

انکے ذمہ یہ ضروری ہے۔ پھر جو شخص اس (وصیت) کے سن لینے کے بعد اس کو تبدیل کر دے گا تو اس کا گناہ ان ہی لوگوں کو ہوگا جو اس کو تبدیل کریں گے

إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۗ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا أَوْ أَشْمًا

اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں ہاں جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی بے عزائی کی یا کسی جرم کے ارتکاب کی

فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا تُؤْتُوا عَلَيْهِمْ إِنَّا اللَّهُ سَعِيدٌ رَاحِمٌ ۝

تحقیق ہوتی ہو۔ پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ واقعی اللہ تعالیٰ تو درخود گناہوں کے معاف کرنے والے ہیں اور ہم کو نیکو کرے گا۔

## وصیت کے احکام

”وَكَيْتَبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةَ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ“ یہاں ”وَكَيْتَبَ“ فرض کے معنی میں ہے، یعنی اپنے مسلمانوں، تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ مال بھی چھوڑ رہا ہو تو والدین اور عزیزوں کے حق میں معروف کے ساتھ وصیت کرے، آیت میں ”خَيْرًا“ سے مراد مال ہے، ”الْأَقْرَبِينَ“ یعنی وہ عزیز واقارب جو ورثہ میں سے نہ ہوں۔ ”بِالْمَعْرُوفِ“ یعنی یہ وصیت ان حدود میں رہتے ہوئے ہونی چاہیے جہاں تک اللہ نے اجازت دی ہے کہ اصل مال کے تہائی حصہ سے زیادہ میں وصیت نہ کرے، اسی طرح وصیت کرنے والے کا مقصد اس سے ورثہ پر ظلم اور ان کی حق تکلیفی بھی نہ ہونا چاہیے۔ ”حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ“ یعنی جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور اس کے احکامات گزار رہے ہیں ان پر یہ لازم ہے۔ اس آیت کی رو سے ہر صاحب مال پر موت سے پہلے اپنے والدین اور ایسے عزیزوں کے لیے وصیت فرض ہے جنہیں اس کے مال میں وراثت نہ ملے۔ اگر اس نے وصیت نہیں کی تو ایک فرض کا چھوڑنے والا سمجھا جائیگا، کیونکہ وصیت کے لیے ”وَكَيْتَبَ عَلَيْكُمْ“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی تم پر فرض کی گئی ہے۔ اس کے بعد ورثہ کے لیے بھی بعینہ یہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ قدرت اور صحت کے باوجود اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھتا تو وہ اللہ کا ایک فریضہ چھوڑتا ہے۔ یہی صورت مال کی موجودگی میں مرتے وقت والدین اور عزیزوں کے لیے وصیت میں بھی ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اس آیت کو اس کے بعد نازل ہونے والی اس آیت سے نسخ اور ناقابل عمل سمجھتی جس میں وراثت کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ زیر تفسیر آیت وراثت کے حکم سے بہت پہلے نازل ہوئی تھی اور ابتر میں صرف وصیت ہی کا حکم تھا، لیکن جب وراثت کے احکام نازل ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی مرتے والے کے مال میں اس کے عزیز واقارب کے حصوں کی تفصیلات بیان کر دیں تو پھر یہ آیت نسخ ہو گئی، یعنی صاحب مال پر مرتے سے پہلے وصیت کرنا فرض نہیں رہا، لیکن بہر حال اہل علم ہی کی ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ یہ آیت کسی بھی دوسری آیت سے نسخ نہیں بلکہ حکم ہے اور اس پر تمام دوسری آیات کی طرح پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت نسخ ہے انہیں اس کی دلیل بھی دینی چاہیے۔ اصل میں اس آیت پر آیت میراث کے ساتھ عمل ہو سکتا ہے۔ دونوں کے مضامین ایک دوسرے کے کسی درجہ میں بھی خلاف نہیں کہ اس آیت کے احکام پر عمل چھوڑنے کے مطالبہ کو معقول کہا جاسکے۔

آیت کی جو تفسیر ہم نے بیان کی وہ متقدمین اور متاخرین اہل علم کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صاحب مال شخص نے مرتے سے پہلے اگر اپنے عزیزوں کے لیے وصیت نہیں کی تو اس نے اپنے عمل کا خاتمہ گناہ سے کیا۔ مسروق، مغیرہ شعبی، عبد اللہ بن عمر اور ابو جہز کے احوال سے ہماری رطبت کی تائید ہوتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، اہل علم کا اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ آیت نسخ ہے یا نہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کا کوئی حصہ نسخ نہیں کیا، بلکہ سب پر عمل ضروری ہے، اس آیت کی رو سے صاحب مال مرتے والے کے لیے اپنے والد اور والدہ



کے لیے وصیت ضروری ہے، اسی طرح اعزہ واقارب کے لیے بھی وصیت ضروری ہے۔ آیت سے مراد تمام اعزہ نہیں ہیں بلکہ صرف وہ ہیں جو وراثت کے حق دار نہیں ہیں۔ اس کی تائید میں ہم نے بہت سے اہل علم کا قول نقل کیا ہے۔ بعض دوسرے اہل علم کے قول سے بھی ہمارے اختیار کردہ مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ جابر بن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے قرابت داروں کو چھوڑ کر اپنے تہائی مال میں سے دوسروں کو وصیت کرتا ہے، حالانکہ اس کے محتاج قرابت دار موجود ہیں تو جتنے مال کی اس نے وصیت کی ہے اس کا ایک تہائی اس کے قرابت داروں کو دے دیا جائے گا اور دو تہائی انہیں دیا جائے گا جن کے لیے مرنے والے نے وصیت کی تھی جس، جابر بن زید اور عبدالملک بن یحییٰ کی ایک روایت میں اس کے برعکس یہ ہے کہ دو تہائی قرابت داروں کو اور ایک تہائی انہیں جن کے لیے وصیت کی گئی ہے دیا جائے گا۔ طاؤس کی روایت میں ہے کہ سب مال لے کر عزیزوں کو دے دیا جائے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ ہے، یہ آیت ابتداء میں نازل ہوئی تھی اور وصیت کو فرض قرار دیا گیا تھا، کچھ دنوں تک اس پر عمل بھی رہا، لیکن پھر میراث کی تفصیلات جب قرآن مجید میں نازل ہو گئیں تو اس سے اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا، اس آیت کی رو سے والدین اور عزیزوں کے لیے صاحب مال مرنے والے پر وصیت ضروری تھی، کیونکہ میراث کا کوئی حکم اب تک نازل نہیں ہوا تھا، لیکن میراث خود اللہ تعالیٰ نے متعین کر دی تو اب عزیز واقارب کے لیے وصیت فرض نہیں رہی چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، طاؤس، حسن، ربیع، علامہ بن زیاد، ایاس بن معاویہ اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے کہ یہ آیت سورہ نسا کی میراث کی اس آیت سے منسوخ ہے جس میں والدین اور دوسرے عزیز واقارب کی میراث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس لیے والدین اور دوسرے ذوات کے حق میں مرنے والا وصیت نہ کرے، البتہ جو رشتہ دار اس کے مال کی وراثت میں حصہ دار نہیں ہو سکتے ان کے لیے وصیت کرے، کیونکہ ان کے لیے وصیت کا حکم آیت میراث سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا تمام حکم منسوخ ہو گیا ہے، کیونکہ یہ وراثت اور فرض کی تفصیلات سے پہلے حکم تھا، اللہ نے جب خود میراث کا حکم نازل کر دیا تو اب کسی پر کسی کے لیے وصیت ضروری نہیں، خواہ وہ قریب کا رشتہ دار ہو یا دور کا۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما، حسن بصری، قاضی شریح، قتادہ، مجاہد، سعدی اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے کہ وصیت کا حکم میراث کی آیت سے منسوخ ہو گیا ہے۔ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور آپ نے کوئی وصیت نہیں کی، پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور آپ نے انتقال سے پہلے وصیت کی، اس لیے جس کا جی چاہے وصیت کرے اور جس کا جی چاہے نہ کرے۔ وصیت فرض نہیں ہے۔ آیت میں ”و خیراً“ سے مراد مال ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، سعدی، ربیع، ضحاک، عطارد، ابی رباح سے یہی منقول ہے۔ مال جس پر وصیت کے وجوب کا حکم ہے، اس کی مقدار بعض حضرات نے ایک ہزار درہم یا اس سے زیادہ بتائی ہے۔ علی بن ابی طالب اور عائشہ رضی اللہ عنہما اور قتادہ اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے یہ مقدار نقل ہوئی ہے۔ لیکن زہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مال کم ہو یا زیادہ تمام صورتوں میں وصیت واجب ہے۔ میرے نزدیک زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ مناسب ہے، کیونکہ مال کم ہو یا زیادہ، خیر کا اطلاق تو سب پر ہو سکتا ہے۔

”فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا أَشْمَتُ عَلَى الدِّينِ يَبْدِلُ لَوْنَهُ“ پھر جو کوئی وصیت کرنے والے کی

وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل دے تو اس بدلنے کا گناہ انہیں لوگوں پر ہوگا جنہوں نے وصیت کو بدلا ہے۔ ”بَدَاكَه“ کی ضمیر ”بَدَاكَه“ کی طرف لٹتی ہے، جو اگرچہ آیت میں لفظوں میں مذکور نہیں ہے، لیکن کلام سے سمجھا جاتا ہے۔ ”سَمِعَهُ“ کی ضمیر بھی اسی طرف لٹتی ہے۔ ”وصیۃ“ چون کہ مؤنث ہے، اس لیے مذکر کی ضمیر اس کی طرف نہیں لوٹ سکتی تھی، ویسے وصیت اور ایسا بہ کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ”رَاشِدَةٌ“ کی ضمیر تبدیلی کی طرف لٹتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر کسی نے وصیت کرنے والے کی وصیت بدل ڈالی تو اس سے وصیت کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی نہیں آتی، اس کا اجر تو اس کی نیت کے مطابق اللہ کے یہاں ملے گا ہی، البتہ گناہ تبدیلی کرنے والے پر ہوگا۔ ہم نے جو تفسیر بیان کی اسی کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، سعدی، عطاء بن ابی رباح، حسن، عبداللہ بن عمر اور سلیمان بن بشر سے بھی منقول ہے۔

”إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ“ بے شک اللہ بڑا جاننے والا ہے، وہ سب کچھ سنتا ہے کہ تم اس کے حکم کے مطابق وصیت کرتے ہو یا نہیں اور تمہاری نیتوں کو خوب جانتا ہے کہ تمہارا ارادہ وصیت میں کسی پر ظلم و زیادتی تو نہیں ہے۔

”فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا وَرِثَةً فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا تُؤْثَمُ عَلَيْهِ“ یعنی کوئی شخص مریض کے پاس آیا، اس کی موت کا وقت قریب ہے اور وہ اس وقت وصیت کر رہا ہے، یہاں اس نے دیکھا کہ وصیت کرنے والا غلطی سے یا ظلماً ایسی وصیت کر رہا ہے جس کا اسے حق نہیں پہنچتا، تو ایسے حالات میں اس شخص کے لیے جو وہاں موجود ہے اور مرنے والے کی وصیت سن رہا ہے کوئی حرج نہیں اگر وہ اس کے اور اس کے ورثہ کے درمیان صلح کرادے، یعنی وصیت کرنے والے کو وصیت میں عدل و انصاف ملحوظ رکھنے کے لیے کہے اور اللہ نے اس کے لیے اس سلسلے میں جو اجازت دی اس سے آگے بڑھنے سے روکے۔ یہ تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”مرنے والے نے جن کے لیے وصیت کی ہے ان میں سے کسی کو یا مسلمانوں کے حاکم کو وصیت کرنے والے کی طرف سے وصیت میں غلطی یا ظلم کا علم ہو اور وہ موصی اہم (جن کے لیے وصیت کی گئی ہے) اور ورثہ کے درمیان صلح کرادے، یعنی اس کی وصیت میں عدل و انصاف کے ساتھ تبدیلی کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، وہ اس کا مجاز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، ربیع اور ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

تیسرا قول عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ ”موت کے وقت وصیت کرنے والے کے عطیہ کے متعلق اگر کسی کو علم ہو جائے کہ اس میں غلطی یا زیادتی کی گئی ہے، یعنی مرنے والے نے بعض وارثوں کو ان کے حق سے کم دے دیا اور بعض کو زیادہ، تو ایسی صورت میں کوئی گناہ نہیں اگر کوئی شخص وارثوں کے درمیان صلح کرادے۔“

چوتھا قول طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ مرنے والے نے وصیت کسی غیر وارث رشتہ دار کے حق میں کی، لیکن اس کا بالواسطہ نفع وارث کو پہنچتا، اس صورت میں اگر کوئی شخص وارثوں میں صلح کرادے تو کوئی گناہ نہیں۔ ہمارے نزدیک پہلا قول جو مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے زیادہ صحیح ہے۔ ”جَنَفٌ“، بمعنی ظلم، خطا اور حق سے تجاوز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، عطاء رضاک اور سعدی رحمہم اللہ سے یہی نقل ہے ”اشد“، جان بوجھ کر غلطی اور حد سے تجاوز۔ مجاہد، ربیع، ابراہیم نخعی، عطیہ، طاؤس، ابن زبیر اور رضاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل ہے، یعنی ”جَنَفٌ“، بمعنی خطا، غلطی جو

تاوانستہ طور پر ہو جائے اور "راشد" جو جان بوجھ کر ہو۔  
 "إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ سَّاجِدٌ" یعنی اگر وصیت کرنے والا سمجھانے پر وصیت میں خطا یا ظلم سے باز آ گیا تو بے شک  
 اللہ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں اور بڑے رحم کرنے والے ہیں، کہ صرف اس کے ارادہ ظلم پر مواخذہ نہیں کریں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے امتوں کے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ

لوگوں پر فرض کیا گیا تھا اس توقع پر کہ تم در روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔ پھر

كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

اُس میں بھی اتنی آسانی کہ جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مریض ہو یا (شرعی) سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار کر کے انہیں (روزہ) رکھنا

عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامِ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا

اس پر (واجب) ہے اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہیں ان کے ذمہ رفتہ رفتہ ایام کا شمار کر کے انہیں (روزہ) رکھنا

فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

شخص خوشی سے (زیادہ) خیر کرے (کہ زیادہ لذت دے) تو اس شخص کے لیے اور بھی بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا اس حال میں (زیادہ) بہتر ہے اگر تم روزہ کی مصلحت کی خبر

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“

یعنی اے وہ لوگو جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہو، روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں

”الصِّيَامُ“ مصدر ہے، اسی سے ”صَمْتُ عَنْ كَذَا“ استعمال ہوتا ہے، یعنی میں فلاں چیز سے رک گیا۔ اس کا

اصل مفہوم ”اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے رک جانا“ ہے۔ ”صَامَتِ النَّحِيلُ“ اس وقت بولتے ہیں جب گھوڑا

چلنا بند کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”إِنِّي نَزَّارٌ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا“ میں بھی ”صَوْمٌ“ سے مراد خاموشی ہے۔

”كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ“ یعنی ”جیسا کہ روزے ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے گزر چکے

ہیں۔“ آیت کے مفہوم اور ہمارے روزوں اور تم سے پہلی امتوں کے روزوں میں تشبیہ کے سلسلے میں مفسرین کے کئی

اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس روزہ کے متعلق بتایا ہے جو اس نے ہم پر فرض کیا ہے کہ

وہ اسی جیسا ہے جو اس سے پہلے نصاریٰ پر فرض کیا گیا تھا، لیکن انہوں نے اس میں تبدیلیاں کر دیں۔ ہمارے اور ان

کے روزے وقت اور مقدار دونوں میں یکساں تھے جس طرح دن میں روزے رکھنا ہم پر فرض ہیں ان پر بھی فرض

دوسرا قول یہ ہے کہ نصاریٰ پر دن ڈوبنے کے بعد دوسرے دن ڈوبنے تک روزہ فرض تھا۔ ابتداء میں مسلمانوں پر بھی انہیں اوقات میں روزہ فرض ہوا تھا پھر بعد میں منسوخ ہو کر سحر سے دن ڈوبنے تک ہو گیا۔ اس قول کے مطابق بھی آیت میں "عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ" سے نصاریٰ ہی مراد ہیں۔ سدی سے روایت ہے کہ نصاریٰ پر بھی رمضان کا روزہ فرض تھا اور وہ بھی افطار کے بعد اگر سو لیتے تو کھاپی نہیں سکتے تھے لیکن چونکہ اس طرح روزے کے ایام کبھی جاڑے میں آتے اور کبھی گرمی میں، اس لئے انہوں نے اس میں دشواری محسوس کر کے تبدیلی کر لی۔ مسلمانوں پر رمضان کے روزے انہیں اوقات میں فرض تھے، لیکن بعد میں حکم منسوخ ہو گیا اور طلوع فجر سے دن ڈوبنے تک روزہ رکھنا فرض ہوا۔ ریح سے بھی یہی قول نقل ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ "عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ" سے تمام اہل کتاب مراد ہیں۔ یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔ چوتھا قول، جو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے، یہ ہے کہ اس سے مراد تمام لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ رمضان میں روزے کے حکم سے پہلے ہر مہینے میں تین دن کے روزے لوگوں پر فرض تھے۔ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب لیا جائے اور اس کے بعد "أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ" (گنتی کے چند دن) سے مراد رمضان کا پورا مہینہ لیا جائے، کیونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آنے والے تمام لوگوں کو آپ کی اتباع کا حکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امام بنا کر بھیجا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا دین حنیفیت اور اسلام تھا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس باب میں وہی حکم ہے جو آپ سے پہلے انبیاء کو تھا۔ تشبیہ وقت میں ہے، یعنی ہم سے پہلے لوگوں پر بھی رمضان کے مہینے کے روزے اسی طرح فرض تھے جس طرح ہم پر فرض ہیں۔ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" یہ حکم اس لئے ہے تاکہ تم کھانے پینے اور عورتوں کے ساتھ ہم بستری سے بچو۔ یعنی میں نے تم پر روزہ، اور ان تمام امور سے بچنے کا حکم نہ رکھا ہے تو روزہ دار نہیں سمجھے جاؤ گے، اس لئے فرض قرار دیا۔ تاکہ تم ان چیزوں سے بچو جو تمہارے روزے کو توڑ دینے والی ہیں۔ تفسیر سدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نقل ہے۔

"وَأَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ" یعنی جو روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں وہ "گنتی کے چند روزے کے ہیں" یہاں "أَنْ تَصُومُوا" تاکہ تم روزے رکھو، محذوف مانا جائے گا۔ "گنتی کے چند روزے" کے روزوں سے مراد کے سلسلے میں مفسرین سے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہر مہینے میں تین دن کے روزے ہیں۔ اس قول کے مطابق یہ روزے رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے لوگوں پر فرض تھے۔ ابن عباس اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما اور عطار اور قتادہ رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہوا ہے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ نے عاشورا اور ہر مہینے میں تین دن روزے رکھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کو فرض کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کے فرض ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو روزے رکھتے تھے وہ نقلی تھے، لیکن آیت میں فرض روزوں کا تذکرہ ہے اور وہ رمضان کے روزے ہیں، اس لئے اس سے بھی مراد رمضان ہی کے روزے ہیں۔ یہ روایت ابن ابی لیلیٰ سے ہے، اور یہی قول راجح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ مسلمانوں پر رمضان کے سوا اور دنوں کے روزے بھی فرض ہوئے ہیں، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ پہلے رمضان کے سوا دوسرے روزے مسلمانوں پر فرض تھے تو اسے اس کی دلیل دینی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ثبوت کسی حدیث یا روایت ہی سے ہو سکتا ہے۔

لیکن ایسی کوئی مضبوط چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لیے جب کہ ”آیَاہِ مَعْدُوْدَاتٍ“ فرض روزوں کے ذیل میں ذکر ہوا ہے تو اس سے رمضان ہی کے روزے مراد ہوں گے۔ ”مَعْدُوْدَاتٍ“ یعنی گنے چنے۔

”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ“ یعنی پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو کہ روزہ اس کے لیے تکلیف دہ ہو، یا بیمار تو نہ ہو لیکن سفر میں ہو تو ایسی حالت میں تم روزہ چھوڑ سکتے ہو، اور تم پر ان دنوں کے بدلہ میں جن میں تم نے روزہ چھوڑا ہے دوسرے دنوں میں، جبکہ تم مریض یا مسافر نہ ہو، اتنے ہی دنوں کا روزہ لازم ہے۔

”وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامٍ مِسْكِينٍ“ اسی طرح اس آیت کی قرارت پر تمام امت کا اتفاق ہے، اور تمام مصاحف میں بھی اسی طرح ہے۔ اس قرارت کے خلاف قرارت کرنا کسی اہل اسلام کے لیے سجا کر نہیں۔ البتہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ”عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ“ پڑھتے تھے۔ ”عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ“ کی تفسیر کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہیں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ روزے فرض ہونے کے ابتدائی دنوں میں یہ حکم تھا کہ غیر مسافر اور غیر مریض، جو روزے رکھ سکتے، انہیں بھی اس کی اجازت تھی کہ چاہیں تو روزے رکھیں اور چاہیں نہ رکھیں، البتہ اگر نہ رکھیں تو ہر دن کے روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ یہ حکم پھر بعد میں منسوخ ہو گیا۔ معاذ بن جبل، سلمہ بن الاکوع، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم، ابن ابی لیلیٰ، علقمہ، عکرمہ، حسن بصری، شعبی، عطاء، ابراہیم، عبیدہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے یہ قول منقول ہے۔ ان حضرات نے فرمایا کہ شروع میں جب روزہ مسلمانوں پر فرض ہوا تو اس کے ساتھ اس کی اجازت و رخصت بھی نازل ہوئی کہ اگر کوئی شخص روزے نہ رکھنا چاہے تو ایک روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو پیٹ بھر کھانا کھلا دے لیکن پھر یہ حکم اس کے بعد کی آیت ”سَوْجُوْا كُوْنِي تَمِّمْ مِنْ سِمْ“ سے منسوخ ہو گیا۔ گو یا رمضان کے روزوں کی فرضیت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اب رمضان میں روزے نہ رکھنے کی صرف مریضوں مسافروں اور ازکار رفتہ بوڑھوں کو اجازت باقی رہی۔ اس قول کی بنیاد پر آیت کا ترجمہ ہوگا ”اور جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہیں (اگر نہ رکھنا چاہیں تو) ان کے ذمہ فدیہ ہے (اور وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے“ آیت کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں سب کے لیے روزہ توڑنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ صرف بوڑھوں کے لیے یہ حکم تھا، لیکن بعد میں جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا اور اب جوانوں کی طرح بوڑھوں پر بھی روزہ فرض ہو گیا، البتہ اگر بوڑھوں میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو تو وہ روزہ توڑ سکتے ہیں اور ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا دیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر، عکرمہ، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی کسی بھی آیت سے منسوخ نہیں ہے، بلکہ محکمات میں سے ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”جو لوگ اپنی جوانی اور صحت کی حالت میں روزے کی طاقت رکھتے ہوں، جب وہ بیمار پڑ جائیں یا بوڑھے ہو جائیں اور اس طرح روزہ رکھنے کی ان میں طاقت نہ رہے تو ایسے لوگوں پر لازم ہے کہ ایک روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں“ آیت کا مطلب ہرگز نہیں کہ روزے کی فرضیت کے بعد کسی وقت بھی مسلمانوں سے، روزے کی طاقت و استطاعت کے باوجود، اس کا حکم اٹھایا گیا تھا، کہ اگر وہ فدیہ دے دیں تو انہیں روزہ توڑنے کی اجازت تھی۔ ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنہما، سدی اور سعید بن مسیب رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ سدی نے فرمایا کہ آیت میں ایسے شخص کا حکم بیان ہوا ہے جو روزہ رکھ رہا تھا اور اسے روزہ رکھنے کی طاقت تھی، پھر اسے کوئی نذر پیش آ گیا اور وہ روزہ رکھنے سے مجبور ہو گیا، مثلاً بیمار ہو گیا، یا

عورت ہے اور اس کے دودھ پلانے کے دن رمضان میں پڑ گئے وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے لئے آیت میں حکم بیان ہوا ہے کہ وہ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے تو انہیں ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلانا ضروری ہے۔

بعض حضرات نے ”یُطِيقُونَ“ کے بجائے ”يُطَوُّقُونَ“ پڑھا ہے۔ یہ قرارت ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہما اور بہت سے دوسرے اسلاف سے منقول ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہو گا کہ ”جو روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں، ان کے ذمہ ہر روز ایک مسکین کا فدیہ ہے“ ان حضرات نے کہا کہ آیت بڑھے مردوں اور عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی کہ اگر بڑھاپے کی وجہ سے ایسے لوگ روزے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور روزہ رکھنے میں انہیں تکلیف ہو تو روزانہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دیا کریں۔ ان حضرات نے فرمایا کہ یہ آیت ہرگز منسوخ نہیں، بلکہ محکم ہے اور اس پر اس کے نزول کے بعد سے قیامت تک عمل ضروری ہے۔ حضرت علی، ابن عباس، عائشہ رضی اللہ عنہم، عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، ابن جریج، ضحاک اور عطاء رحمہم اللہ سے مذکورہ بالا تفسیر نقل ہوئی ہے۔ عطاء نے فرمایا کہ جس بڑھے آدمی میں روزہ رکھنے کی سکت ہی باقی نہ ہو اس کے لئے فدیہ دینے کا حکم ہے، لیکن اگر مشکل کے ساتھ ہی سہی، بہر حال رکھ سکتا ہو تو اسے معذوں نہیں سمجھا جائے گا۔ میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ یہ آیت اس سے بعد آنے والی آیت ”سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر روزہ رکھے“ سے منسوخ ہے، کیونکہ ”سَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ“ میں ”لَا“ کی ضمیر سے مراد ”روزہ“ ہے، اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”اور جو کوئی روزہ کی طاقت رکھتا ہو اس کے ذمہ فدیہ ہے (اگر وہ روزہ نہ رکھے، اور وہ فدیہ) ایک مسکین کا کھانا ہے“۔ اس پر تو بہر حال تمام ہی اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص تندرست و صحت مند ہے اور روزہ رکھ سکتا ہے اور مسافر بھی نہیں تو رمضان کے پورے مہینے میں روزے رکھنا اس پر فرض ہے اور روزہ توڑ کر اس کے بدلے فدیہ دینا بجا نہیں۔ امت کا یہ اجماع بتاتا ہے کہ زیر تفسیر آیت منسوخ ہے کیونکہ اس میں بلا کسی قید کے روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت ہے۔ جو روایات ہم نے معاذ بن جبل، ابن عمر اور سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہم سے اس سلسلے میں نقل کی ہیں اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لوگ رمضان کے مہینے کے روزے رکھتے تھے، لیکن اگر کوئی نہ رکھتا تو اسے ایک مسکین کا کھانا فدیہ کے طور پر دینا پڑتا تھا اور یہ ایک دن کے روزہ کا بدلہ ہو جاتا تھا لیکن پھر جب اس کے بعد کی آیت ”سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر روزہ رکھے“ نازل ہوئی تو پہلا حکم فدیہ کا منسوخ ہو گیا اور اب مجبوری کی چند مخصوص صورتوں کو چھوڑ کر ہر شخص پر روزہ رکھنا فرض ہو گیا۔ اس کے بدلے میں فدیہ دینے کی اجازت باقی نہیں رہی۔ البتہ مریض اور مسافر کے لئے رمضان کے روزے چھوڑنے کی اجازت ہے، اس طرح آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، جس کے راوی انس رضی اللہ عنہ ہیں، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت بھی رمضان کے روزے چھوڑ سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رمضان کا مہینہ آجائے اور عورت حمل سے ہے یا دودھ پلا رہی ہے اور روزے رکھنے کی اس میں طاقت نہیں تو اسے بھی روزے چھوڑنے کی اجازت ہے۔

ابتداء اسلام میں، جب روزے کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت تھی، تو ایک روزہ کے بدلے کتنا فدیہ دینا واجب تھا؟ اس سلسلے میں اہل علم کے کئی اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق آدھا صلح (سوا دوسیر) کہیں کسی مسکین کو دینا واجب تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک مد تقریباً ایک سیر، اور ایک دن کے کھانے کی دوسری ضروریات۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آدھا

صلع گیہوں یا ایک صلع کھجور یا منقہ دینا تھا۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ روزہ توڑنے والا جو کچھ بھی روزہ توڑنے والے دن کھائے گا وہ سب کچھ ایک مسکین کو دینا ضروری تھا۔ وغیر ذالک۔

”فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهِ“ (اور جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے اس کے حق میں بہتر ہے)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر یہ نقل ہے کہ ”جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے، یعنی ایک مسکین کے بجائے دو مسکینوں کا کھانا دیدے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے“ مجاہد، طاؤس، عطار اور سدی رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ”جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے یعنی فدیہ کے ساتھ روزہ بھی رکھ لے تو اس کے حق میں بہتر ہے“ یہ ابن شہاب رحمہ اللہ سے روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں نقل ہے کہ ”ایک مسکین کے کھانے میں اضافہ کرنے سے روایت اس کے حق میں بہتر ہے“ بہر حال آیت کے الفاظ عام ہیں، اور جتنے اقوال اس کی تفسیر میں بیان کیے گئے ہیں سب کے لیے گنجائش ہے کہ سب ہی نیکی کی صورتیں ہیں۔

”وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ یعنی رمضان کے مہینے میں جو روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں اگر انھیں رکھو تو یہ تمہارے لیے روزے چھوڑ کر فدیہ دینے سے بہتر ہے“ سدی، ابن شہاب اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم سے یہ تفسیر منقول ہے۔

شَهْرًا مَضَانِ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ الْكَرِيمُ

(روزہ تھوڑے دن) ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لیے

لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ

(ذریعہ) ہدایت ہے اور دوسرا (وصف) واضح الدلالة ہے منجملہ ان کتب کے جو کہ (ذریعہ) ہدایت (بھی) ہیں اور (ذریعہ) باطل ہیں (فیصلہ کرنیوالی (بھی) ہیں

مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ

سوجوش شخص اس ماہ میں موجود ہو اسکو فرضاً اس میں روزہ رکھنا چاہیے اور جو شخص بیمار ہو سفر میں ہو

سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ

تو دوسرے ایام کا (انتاہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا اس پر (واجب) ہے اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے

وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ

اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ (ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو کہ آج میں کئی ہی ایام تم لوگ اللہ تعالیٰ کی

عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

بزرگی (دستا) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا جس سے تم برکات صیام رمضان سے محروم نہ رہو گے (اور) غنیمت سے خاص رمضان میں روزہ رکھنے

ص کی اجازت اس لیے دیدی تاکہ تم لوگ اس نعمت آسانی پر اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔

## بابرکت مہینہ، اس کے فرائض اور خصوصیتیں

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ  
الهُدَى وَالْفُرْقَانِ "شہر" (مہینہ) کی اصل "شہرۃ" ہے،

بولتے ہیں "شہر فلان سببہ" فلاں نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی، سونت لی، "شہر الشہر" یعنی مہینے کا  
چاند طلوع ہوا۔ "رَمَضَانُ" نام کی وجہ، زبان عرب پر بصیرت و معرفت رکھنے والے بعض حضرات کی نظر میں، یہ ہے کہ  
(بعض سالوں میں) جو شدت کی گراں اس مہینے میں پڑتی ہے اس کی وجہ سے یہ نام پڑا، (رمض، بمعنی شدت کی گری سے  
ماخوذ) اسی طرح کی مناسبت کے پیش نظر اس مہینے کو جس میں حج کیا جاتا ہے "ذوالحجہ" کہتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ  
علیہ اس مبارک مہینے کو صرف "رمضان" کہنا پسند نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ کے ناموں میں سے  
ایک نام ہو، اس لیے اسے "شہر رمضان" (رمضان کا مہینہ) کہنا چاہیے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اسی طرح استعمال  
کیا ہے۔ "شہر" کو رفع اور نصب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "یہ (رمضان کا مہینہ ہے جس میں  
قرآن اتارا گیا) ان مجید رمضان ہی کے مہینے میں لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا، پھر اللہ تعالیٰ  
جب اور جس لوح پابستارہ آسمان دنیا سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آہستہ آہستہ اتارتا رہا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر  
سدی اور شیبانی رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت میں ہے کہ قرآن مجید لوح محفوظ  
سے ایک ہی مرتبہ میں ہوا کا پورا رمضان کے مہینے میں "بیت محمور" پر اتار دیا گیا تھا۔ بیت محمور آسمان دنیا میں ستاروں کی  
جگہ کا نام ہے۔ یہیں پر قرآن لاکر محفوظ کیا گیا، اور پھر یہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا جاتا رہا۔ واما رضی اللہ عنہ سے  
روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "صَحَّحْنَا ابْرَاهِيمَ" رمضان المبارک کی پہلی رات میں نازل کیے گئے،  
تو ریت بھی رمضان ہی میں نازل کی گئی، انجیل رمضان کے تیرہ دن گزرنے کے بعد نازل کی گئی، اور قرآن مجید جو بیس رمضان  
کو (شب قدر میں) نازل کیا گیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ "إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي  
لَيْلَةِ الْقَدْرِ" (بے شک ہم نے نازل کیا قرآن کو لیلۃ القدر میں) میں اسی مضمون کا ذکر ہے۔

"هُدًى لِّلنَّاسِ" وہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے، (حق کے راستے کی طرف) "بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى" یعنی  
اس میں ہدایت کے نئے ہوتے و لائل ہیں جن سے اللہ کے حدود، اس کے فرائض اور اس کے حرام و حلال کا علم ہوتا ہے  
"وَالْفُرْقَانِ" سے راو حق و باطل کے درمیان امتیاز ہے، سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں صاف طور پر حلال و  
حرام بیان کر دیا گیا ہے۔

"فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" (سو تم میں سے جو کوئی اس مہینے کو پائے، لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر  
روزے رکھے اور شہود شہر، (مہینے کو پالینا) سے مراد ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ رمضان کے چاند  
کے طلوع ہونے کے وقت وہ کسی سفر وغیرہ میں نہیں تھا، بلکہ اپنے گھر ہی مقیم تھا۔ یعنی جب رمضان کا مہینہ آیا اور ایک آدمی  
اپنے گھر ہی مقیم ہے تو اس پر فرض ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے، خواہ اس کے بعد مقیم رہے یا مسافر۔ البتہ اگر  
رمضان کا چاند سزا میں دیکھا تو اسے اجازت ہے چاہے روزہ رکھے یا نہ رکھے (اور بعد میں قضا کرے)۔ عبیدہ سلمانی،  
سدی اور ابراہیم رحمہم اللہ سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ بھی یہی فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص رمضان کے  
مہینے کی ابتداء کے وقت مقیم تھا، اور پھر سفر شروع کیا تو اس پر روزہ رکھنا ضروری ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ام درہ



نے بیان کیا کہ میں رمضان میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے پوچھا کہ کہاں سے آ رہی ہو؟ میں نے کہا کہ اپنے بھائی حنین کے پاس سے۔ پوچھا کہ وہ کیسے ہیں؟ کہا کہ میں جب ان سے رخصت ہوئی تو سفر کا ارادہ کر رہے تھے۔ آپؐ نے اس پر فرمایا کہ ان سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ سفر نہ کریں، اگر سفر کے دوران میں رمضان کے مہینے کو میں پالوں تو اس کے لیے میں کہیں اقامت کروں گی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”جو کوئی رمضان کے مہینے کو پالے، تو اس مہینے کے چھ دن اس سے پائے ہیں ان میں روزے رکھے“ ابو میسرہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ آپ کے متعلق راویوں کا بیان ہے کہ آپؐ نے رمضان کے مہینے میں سفر کے ارادہ سے نکلے اور روزے سے تھے، راستہ میں دریائے فرات آیا تو آپؐ نے اس کا پانی پی کر روزہ توڑ لیا۔ علی رضی اللہ عنہ کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ سعد رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ سے تین میل دوران کی ایک زمین پر تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا ہم مدینہ واپس لوٹے تو علی رضی اللہ عنہ نے اس کو سواری تھی، لیکن میں پیدل تھا چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا لیکن مجھے انھوں نے روزہ توڑنے کا حکم دیا جس پر ہری اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ نے فرمایا کہ اگر رمضان شروع ہونے کے وقت کوئی شخص مقیم تھا، پھر بعد میں اس نے سفر کیا تو وہ روزہ توڑ سکتا ہے۔ شعبی نے رمضان میں سفر کیا تو ایک مقام پر پہنچ کر روزہ توڑ لیا۔ شعبی نے بیان کیا کہ میں نے رمضان میں سفر کا ارادہ کیا تو حکم اور حدیث سے اس کے متعلق پوچھا۔ ان حضرات نے فرمایا کہ سفر کرو۔ حدیث سے پوچھا کہ اگر ایسا ہے تو وہ روزہ توڑ سکتا ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ رمضان کے ابتدائی دس دنوں کے بعد میں مقیم رہنا ہی پسند کروں گا۔

تیسرے قول میں آیت کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”جو شخص عاقل، بالغ اور مکلف ہونے کی حالت میں رمضان کو پالے لازم ہے کہ مہینہ بھر روزہ رکھے“ یہ نزل ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا ہے۔ آپ حضرات فرماتے تھے کہ رمضان کا مہینہ آیا اور ایک شخص عاقل بالغ ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے۔ پھر اگر اس پر رمضان ہی میں انہوں کی کیفیت طاری ہوگئی، اور رمضان ختم ہونے کے بعد اگر کی یہ بیماری جاتی رہی تو اس پر لازم ہے کہ ان دنوں کے روزوں کی قضا کرے جن میں وہ جنون میں مبتلا تھا، کیونکہ اس پر رمضان کے مہینے کو پایا تھا اور روزہ اس پر فرض تھا یہی حکم اس شخص کا ہوگا جس پر جنون پہلے ہی سے طاری تھا اور اسی حال میں رمضان کا مہینہ آ گیا، لیکن رمضان کے ختم ہونے سے پہلے ہی اسے آفاقہ ہو گیا، تو چونکہ اس نے بھی رمضان کے مہینے کو پایا ہے، اس لیے حالت صحت میں، چھوٹے ہوئے، روزوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ لیکن اس کے برخلاف اگر رمضان کا پورا مہینہ گزر گیا اور ازاول تا آخر وہ جنون کی حالت میں ہی رہا تو اس پر رمضان کے روزوں کی قضا لازم نہیں کیونکہ وہ رمضان کے مہینے کو پالے والا نہیں ہے۔ لیکن یہاں بے معنی تفسیر ہے۔ اگر جنون ایسی چیز ہے کہ اس سے پورے مہینے کا روزہ ساقط ہو سکتا ہے، جبکہ رمضان شروع ہونے سے پہلے سے ختم ہونے کے بعد تک کسی شخص پر طاری رہا ہو، تو رمضان کے شروع ہونے کے بعد درمیان میں کسی پر طاری ہونے کی صورت میں بھی ان دنوں کے روزے ساقط ہونے چاہئیں جن میں جنون کا اثر نہ رہا ہو۔ دونوں صورتوں میں فرق کو نہ دیکھیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کی عقل جنون یا کسی بھی وجہ سے جاتی رہی، اور رمضان کی ابتداء سے پہلے سے ختم کے بعد تک یہ کیفیت رہی، پھر بھی چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا فرض ہے۔

۱۱۔ ”شہود“ کے معنی موجود ہونے کے ہیں۔ اہل عرب اس معنی میں سے عام طور سے استعمال کرتے ہیں، ارادہ کو لگایا (باقی بر صفحہ ۱۲)

جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقیم ہونے کی حالت میں رمضان کو پالے، یعنی رمضان کا جب چاند دکھائی دیا تو وہ مقیم تھا، ایسا شخص اگر بعد میں رمضان کے دنوں میں سفر کرے گا تو اس پر لازم ہے کہ روزے رکھے اور سفر کا عذر کر کے نہ توڑے تو یہ تفسیر قطعی طور پر باطل اور بے بنیاد ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ صبح مکہ کے موقع پر مدینہ سے رمضان میں نکلے تھے اور رمضان کے بہت سے دن گزر چکے تھے جن میں آپ نے روزے رکھے تھے پھر جب سفر شروع کیا تو آپ نے خود بھی روزہ توڑا اور صحابہ رض کو بھی توڑنے کا حکم دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُن حضور نے رمضان میں مدینہ سے مکہ کا سفر کیا، جب آپ مقام ”عسفان“ پر پہنچے تو آپ نے پانی منگوایا، پھر آپ نے پانی کے برتن کو اپنے ہاتھ پر رکھا، تاکہ سب لوگ دیکھ لیں اور اس کے بعد آپ نے پانی پی لیا ایک روایت میں ہے کہ دن یا بیس دن رمضان گزرنے کے بعد آپ نے فتح مکہ کا یہ سفر شروع کیا تھا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھارہ رمضان کے بعد سفر میں نکلے، ہم میں سے بہت سے لوگ روزہ سے تھے اور بہت سوں نے روزہ توڑ لیا تھا، نہ روزہ داروں نے روزہ توڑنے والوں پر کوئی اعتراض کیا اور نہ توڑنے والوں نے رکھنے والوں پر۔

تین اقوال میں سے دو کے متعلق واضح ہو گیا کہ وہ صحیح نہیں ہیں، اس لیے دوسری تفسیر یعنی ”جو کوئی رمضان کے مہینے کو پالے تو جتنے دن اس نے مقیم ہونے کی حالت میں پالے ہیں ان میں روزے رکھے لیکن اگر کوئی شخص مریض ہے یا مسافر ہے تو دوسرے دنوں میں چھوڑے جائیں گے روزوں کی قضا اس پر لازم ہے“

رہنہ حاشیہ صفحہ ۷۱) عربی میں ”شہادہ“ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ واقعہ کے وقت موجود ہوتا ہے۔ ”شہد الشہر“ کا بھی مفہوم یہ ہو گا کہ جو کوئی رمضان کے مہینے میں موجود ہو، تو لازم ہے کہ روزہ رکھے۔ اصلاً آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو لوگ رمضان میں زندہ ہوں ان پر روزہ لازم ہے۔ لیکن نابالغ بچوں، سب کا اتفاق ہے، کہ روزہ واجب نہیں ہے، اس لیے نماز کے موجود ہونے کی دو صورتیں بتائی ہیں، ایک ذاتاً موجود ہونا، اور دوسرے عقلاً موجود ہونا۔ عقلاً موجود ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ رمضان کے مہینے اور اس کے احکام کا اسے شعور و احساس بھی ہو۔ اور ان تفصیل کے بعد ہر غیر عاقل، غیر بالغ اور غیر مکلف شخص اس آیت کے حکم سے نکل جاتا ہے۔ علامہ ابن جریر نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ جب تک کہ کیفیت اگر شروع سے آخر تک رمضان کے مہینے میں طاری رہی تو اس پر روزہ آخر کیوں نہیں فرض ہے جبکہ احناف کے نزدیک بھی ایسے مجنون پر اس رمضان کے پورے مہینے کا روزہ فرض ہے جو اس مہینے کے بعض دنوں میں صحت مند رہا ہو اور اس پر ان دنوں کی کیفیت طاری نہ رہی ہو، حالانکہ سب کہتے ہیں کہ اگر نابالغ بچہ رمضان میں بالغ ہو گیا تو بلوغ کے بعد کے دنوں کے روزے اس پر فرض ہوں گے۔ یہی صورت مجنون کی بھی ہے۔ کیونکہ دونوں کے احکام اس حیثیت سے اس باب میں یکساں ہیں کہ دونوں عقلاً شہود شہر نہیں رکھتے۔ اعلیٰ میں علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو تفسیر منسوب کی ہے وہ آیت کی تفسیر سے زیادہ ایک فقہی مسئلہ ہے۔ جو اصلاً اجتہاد و استنباط سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کے استنباط کے وقت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دوسرے دلائل و شواہد بھی تھے۔ تفسیر کے ذیل میں اس مسئلہ کو اس طرح ذکر کرنا جیسا کہ مصنف نے کیا ہے، مغالطہ پیرا کرتا ہے۔ جہاں تک راجح تفسیر کا تعلق ہے تو احناف کے نقطہ نظر سے بھی وہی تفسیر راجح ہے جسے مصنف نے راجح قرار دیا ہے۔ (ماتر جہا)

«وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ» یعنی جو کوئی رمضان کے مہینہ میں مریض ہو یا سفر میں ہو اور روزہ نہ رکھے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے بدلے میں رمضان کے بعد اتنے ہی دنوں کے روزے رکھے جتنے دنوں کے روزے اس نے رمضان میں چھوڑے ہیں۔ «مرض» جس کی وجہ سے رمضان کا روزہ توڑنا جائز ہے، اس کی حد کی تعیین میں اہل علم کے کئی اقوال ہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد ایسا مرض ہے جس میں مریض نماز کے لیے کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو جس اور ابراہیم رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ہر وہ مرض جس میں روزہ رکھنا مرض کی زیادتی کا باعث بن سکتا ہو، اس میں روزہ توڑنا جائز ہے۔ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ہر وہ مرض مراد ہے جسے عرف عام میں مرض کہا جاسکتا ہو۔ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں طریف بن تمام عطار دی حاضر ہوئے، رمضان کا مہینہ تھا۔ ابن سیرین نے کھانا کھا رہے تھے، لیکن طریف نے کچھ نہیں پوچھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میری اس انگلی میں درد ہو گیا تھا، اس لیے میں نے روزہ نہیں رکھا، ہمارے نزدیک بہتر قول یہ ہے کہ اسی مرض میں روزہ توڑنے کی اجازت ہے جس میں روزہ رکھنا ناقابل برداشت ہو، اگر کسی مریض کی اس درجہ بڑی حالت ہو تو وہ روزہ توڑ سکتا ہے، اور اس کے بدلے میں اتنے ہی دنوں کے روزوں کی قضا کرے جتنے روزے اس نے نہیں رکھے ہیں۔ «فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ» کا مفہوم ہے «ان دنوں کے سوا دوسرے گئے چنے دن»۔ «اُخَرَ» آخری کی جمع ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ مرض کی حالت میں روزہ توڑنا اللہ کی طرف سے عزیمت ہے اور واجب ہے، صرف رخصت کے درجہ کی چیز نہیں کہ چاہا توڑ دیا اور چاہا نہ توڑا۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اور صحابہ کرام رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حالت سفر میں روزہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے، اگر تم کسی کو کوئی چیز خوشی سے دوادوہ لینے سے انکار کرو گے تو کیا تمہیں غصہ نہیں آتے گا؟ سفر کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزہ کی رخصت کا بھی یہی حال ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزہ رکھے گا پھر بھی اس پر اس کی قضا لازم ہوگی۔ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے سفر میں روزہ رکھا تھا تو آپ نے اس سے دوبارہ روزہ رکھنے کے لیے کہا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسی حالت میں قضا کا حکم دیا تھا۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں روزہ کا حکم عام حالات میں دیا ہے، اور اس کے بعد مریض اور مسافر کا اس سے استثناء کیا ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی قضا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم صرف مقیم کے لیے ہے، اس لیے جس طرح مقیم کے لیے روزہ توڑنا جائز نہیں اسی طرح مسافر اور مریض کے لیے روزہ رکھنا درست نہیں، کیونکہ وہ رمضان کے پانے والے نہیں ہیں، ان پر روزہ دوسرے دنوں میں فرض ہے۔ ان کے اس خیال کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول حدیث سے ہوتی ہے۔ عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہے جیسا کہ مقیم ہو کر روزہ توڑنے والا دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا صرف مباح اور رخصت ہے، روزہ رمضان میں روزہ بہر حال فرض ہے، اور جو شخص بھی ان دنوں میں روزے رکھے گا اپنا فرض ادا کر دیکھا، البتہ اگر مسافر یا مریض روزہ نہیں کھے



تندرست کے کسی امتیاز کے بغیر سب پر فرض ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی تو اترے کے ساتھ آیا ہے کہ مسافر کے لیے  
 رمضان کے روزے چھوڑنے کی صرف رخصت ہے، اگر چاہے تو رکھ سکتا ہے اور چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ  
 عنہا نے بیان کیا کہ حمزہ سلمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر میں روزہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ  
 اگر چاہو تو رکھ لو اور اگر چاہو چھوڑ دو۔ حمزہ سلمی رضی اللہ عنہ ایک روایت میں خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 سے پوچھا، یا رسول اللہ میں لگاتار دو روزے رکھتا ہوں، کیا سفر میں بھی رکھ سکتا ہوں؟ آپ نے حضور سے فرمایا کہ یا رسول اللہ کی طرف  
 سے اپنے بندوں کے لیے رخصت ہے پس جو روزے رکھتا ہے وہ اچھا کرتا ہے، اور جو چھوڑتا ہے اس کے لیے  
 کوئی خرچ نہیں۔ چنانچہ حمزہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، چاہے سفر میں ہوں یا حضر میں، عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی  
 ہمیشہ خواہ سفر میں یا حضر میں روزہ رکھتے تھے اور یہی رسول ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا تھا۔ اگر ہم اس باب کی روایتیں بیان کرنے  
 لگیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا صرف رخصت ہے، نہ کہ عزمیت، تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث اور نکتہ مذکور ہے، اس کی روایتیں بھی مسلسل اور متواتر ہیں، اور اس کا بھی  
 حاتمہ لینا ضروری ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں دیکھا کہ ایک شخص کو  
 ایک گھیرے ہوئے ہیں اور اس پر سایہ کر رکھا ہے، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون شخص ہے؟ صحابہ نے بتایا کہ روزہ  
 دار۔ آپ حضور نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے، لیکن اس حدیث میں قابلِ غور چیز یہ ہے کہ آپ حضور نے  
 پورا شاد ایک ایسے روزہ دار کے متعلق فرمایا جس کا روزہ کی وجہ سے بُرا حال تھا کہ وہ سروں کو اس کی حفاظت اور اسے  
 آرام پہنچانے کی ضرورت پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ نہ رکھنا  
 کے متعلق فرمایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر اپنی جان کی حفاظت فرض فرمادی ہے اور اسے  
 دانستہ ہلاکت میں ڈالنا حرام رکھا ہے، ظاہر ہے کہ روزہ بھی وہی نیکی و رخصت ہوگا جس کی ترغیب اللہ نے دی ہے، جو روزہ  
 جان لیوا ثابت ہووے کس طرح نیکی ہو سکتا ہے، اس سے تو اللہ نے روک رکھا ہے۔ اس مضمون کی جو احادیث ہیں حضور کی طرف سے  
 کی گئی ہیں کہ سفر میں روزہ رکھنے والا حضر میں روزہ توڑنے والے جیسا ہے، اولیٰ تو اس حدیث کی بہنی سنیں ہیں وہ سب  
 لغو اور ناقابلِ اعتبار ہیں، اور اگر اس مضمون کی حدیث ثابت بھی مان لی جائے تو اس کا بھی نشاں ہی ہوگا جو اس سے پہلے والی حدیث  
 کا ہے کہ جب روزہ ہلاکت کا باعث ہو تو اسے توڑ دینا ضروری ہے۔

”يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ“ یعنی اسے تمہارا سہولت ہے، لیکن تمہارے لیے سہولت نہیں ہے، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ ان حالات میں روزہ تمہارا  
 توڑنے کی رخصت دی ہے، تو یہ محض تمہاری آسانی کے لیے ہے، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ ان حالات میں روزہ تمہارا  
 لیے دشوار ہو سکتا ہے، اور اللہ تم پر دشواری اور تنگی نہیں کرنا چاہتا، کہ سب کچھ جانتے ہوئے مسافر اور بیماری میں بھی تم پر  
 روزہ فرض رکھے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے کہ ”يُسْرٌ“ اور ”يُسْرٌ“ سے مراد سفر میں روزہ نہ رکھنا  
 اور ”الْعُسْرُ“ (دشواری) سے مراد سفر میں روزہ رکھنا ہے، آپ سے سفر میں روزہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے  
 فرمایا کہ ایک میں سہولت ہے اور دوسرے میں دشواری ہے، اللہ کی دی ہوئی سہولت کو اختیار کرو۔ مجاہد قتادہ اور  
 ضحاک رحمہم اللہ سے بھی آیت کی یہی تفسیر نقل ہوئی ہے۔  
 ”وَلَا تُكَلِّمُوا الْعَسْفَةَ“ یعنی یہ کہ تم نہ بھولنا کہ روزہ کے روزے سفر یا مرض کی وجہ سے چھوڑ دینے

ہیں دوسرے دنوں میں جب تم سفر سے لوٹا آؤ یا مقیم ہو جاؤ تو اتنے ہی روزے قفنا کر لو۔ یہ تفسیر ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔

وَلِتَكْبِرُوا لِلَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ ۖ اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کیا کرو، اس احسان پر کہ اس نے تمہیں وہ راستہ بتا دیا ہے جسے دوسرے دین والوں نے بھلا دیا تھا، حالانکہ تمہاری طرح ان پر بھی رمضان کے روزے فرض تھے، لیکن وہ گمراہ ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی مخصوص نوازشوں کے نتیجے میں ہدایت دی اور اپنے فرض کی اداسگی کی توفیق بخشی، اس لیے تمہیں طاعت و عبادت کے ذریعہ اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور عید الفطر کے دن کی تکبیر کے ذریعہ اس کی عظمت بیان کرنی چاہیے۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے کہ مراد عید الفطر کی تکبیرات ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مسلمانوں پر یہ ضروری ہے کہ جب شوال کا چاند دکھیں تو تکبیر کہنا شروع کر دیں، اور عید سے فارغ ہونے تک تکبیر کہتے رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”اور یہ کہ تم شمار کی تکبیر کر لیا کرو، اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمہیں راہ بتا دی“ ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ صبح کے وقت عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر کہیں، جب تکبیر کہتے ہوئے ہیں، لیکن جب امام منبر پر آجائے تو خاموش ہو جائیں۔ پھر جب امام تکبیر کہے تو سب لوگ تکبیر کہیں، لیکن امام کے آنے کے بعد صرف اس کی تکبیر پر تکبیر کہی جائے گی، اس کے سوا خود سے نہ کہنی چاہیے۔ پھر جب امام فارغ ہو گیا اور نماز پوری ہو گئی تو عید بھی پوری ہو گئی۔ زید بن اسلم سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ”وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ اور تاکہ تم اللہ کے ان انعامات و احسانات پر اس کا شکر ادا کرو۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو آپ میری طرف سے فرادے (پہنچے) میں قریب ہی ہوں اور استنار نامنا اور خواست کے منظور کر لیتا ہوں

الدَّاعِ إِذَا دَعَا ۖ إِنَّي سَمِيعٌ ۖ قَرِيبٌ ۖ وَلِيُؤْمِنُوا بِآيَاتِ

رہبر عرضی درخواست کر نیوالے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے سوان کو چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین رکھیں

رَبِّكُمْ ۖ لَعَلَّكُمْ يَرْشُدُونَ ۝

امید ہے کہ وہ لوگ رشد و فلاح حاصل کر سکیں گے۔

”وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا“  
یعنی اے محمد اگر میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کریں کہ میں کیا ہوں، تو میں ان سے قریب ہی ہوں، ان کی دعاؤں کو سنتا ہوں اور دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔

آیت کے شان نزول کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اے محمد کیا ہمارا رب ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کے اظہار میں دعا کریں، یا دور ہے کہ اسے پکار پکار کر متوجہ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ میں اپنے بندوں سے

قریب ہی ہوں، جب دعا کرنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں جس رحمت اللہ علیہ سے یہ قول نازل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ”مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا،..... تو کچھ لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کس وقت اللہ سے دعا کرنی چاہیے؟ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اس قول کی بنیاد پر آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جس وقت بھی تم مجھ سے دعا کرو، میں تمہارے قریب ہی ہوں اور تمہاری دعاؤں کو سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں۔ یہ قول عطار بن ابی رباح اور سدی رحمہما اللہ سے روایت ہے۔ سدی نے فرمایا کہ جب بھی کوئی مومن بندہ اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ اس کی دعا قبول کرتا ہے، البتہ جس چیز کی وہ دعا کرتا ہے اگر وہ اس کے لیے مقدر ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے وہ چیز مل جاتی ہے، اور اگر مقدر نہیں ہوتی تو آخرت میں اس کے بدلے اُسے ثواب ملتا ہے اور دنیا میں پیش آنے والی کوئی ناگوار چیز اس سے دفع کر دی جاتی ہے۔ ابن صالح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمیں یہ حدیث معلوم ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کوئی بندہ ایسا نہیں جسے دعا کی توفیق دی گئی ہو اور پھر اس کی دعا قبول نہ کی گئی ہو۔ گرنی خواستے و ادنیٰ وادے خواست۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جب آیت ”مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا“ نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ”ہم اللہ سے دعا کس رخ ہو کر کریں؟“ اس پر آیت ”جس طرف بھی تم اپنا رخ پھیرو اللہ ادھر ہی ہے، بے شک اللہ بڑا وسعت رکھنے والا، بڑا بھاننے والا ہے“ نازل ہوئی۔

چوتھا قول یہ ہے کہ ان لوگوں کے جواب میں نازل ہوئی سمجھوں نے کہا تھا کہ ہم اللہ سے دعا کس طرح کریں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ قول قرادہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

”فَلَيْسَتْ جَبِيئًا لِي“ پس تم بھی میرے احکام قبول کرو اور میری طاعت کرو۔ ”استجاب“ بھی اجاب کے معنی میں آتا ہے۔ یہ تفسیر مجاہد اور ان کے علاوہ مفسرین کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مفہوم ہے ”وہیں تمہیں چاہیے کہ مجھ سے دعا کرو“ یہ معنی ابورجاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہیں۔

”وَوَلِيُّوْا بِنِي“ اور مجھ پر ایمان لاؤ اور میری تصدیق کرو۔ لیکن جو حضرات ”فَلَيْسَتْ جَبِيئًا لِي“ کا مفہوم ”وہیں تمہیں چاہیے کہ مجھ سے دعا کرو“ بیان کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ ”میں تمہاری دعا قبول کروں گا“ ابورجاء خراسانی سے یہی معنی نقل ہیں۔

”وَلَعَلَّكُمْ تَزِدُّوْنَ“ اور تاکہ تم اپنے اس عمل کے نتیجے میں ہدایت پا جاؤ۔

بہت سے لوگ دعا کرتے ہیں اور ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، یعنی اللہ تعالیٰ سے جس چیز کی طلب و دعا کرتے ہیں وہ انہیں نہیں ملتی۔ یہ ایک مشاہدہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیت میں بلا کسی تخصیص کے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے، حالانکہ ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ بہت سی دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب دو طرح دیا گیا ہے ایک یہ کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص عمل کے ذریعے مجھے پکارتا ہے یعنی میری اطاعت کرتا ہے اور احکام کی پیروی کرتا ہے تو میں اس کے اس عمل کو قبول کرتا ہوں اور اس پر ثواب دیتا ہوں۔ اس صورت میں ”واجابۃ“ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کرنے والوں سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرتا ہے، حدیث میں بھی دعا کو عبادت کہا گیا ہے، نعمان بن بشیر

رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دعا و عبادت سے، پھر پانچ آیت کی تلاوت کی، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکر کرتے ہیں انہیں جہنم میں ذلیل و خوار داخل کیا جائے گا" اس حدیث میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دعا بھی عبادت ہے، اور دعا کرنے کا مطلب عبادت و طاعت ہے جس رحمتہ اللہ علیہ نے بھی عمل و طاعت ہی اس کا مفہوم بیان کیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگرچہ آیت کے الفاظ عام ہیں، لیکن مفہوم میں عموم نہیں، بلکہ دعا کی قبولیت اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، یعنی اگر میں چاہتا ہوں تو دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔

أَجَلٌ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَّتُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا کیونکہ وہ تمہارے رجبائے اور

لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلَيْهِمُ اللَّهُ أَنْتُمْ كُنْتُمْ خِتَانُونَ

بچھونے والے (رکے) میں اور تم ان کے رجبائے اور مشغول بچھونے والے (رکے) ہو۔ خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم خیانت رکے کے گناہ میں

أَنْفُسَكُمْ فَمَا بَ عَلَيْكُمْ وَعَمَّا عَنْكُمْ فَالْتَنَ بِأَشْرَوْهِنَّ

اپنے کو مبتلا کر رہے تھے مگر غیر اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا سو اب ان سے ملو ملاؤ

وَابْتِغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمْ

اور جو (قانون اجازت) تمہارے لیے تجویز کر دیا ہے (بلا تکلف) اس کا سامان کرو اور کھاؤ اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید

الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ مَا شَرِبْتُمْ

خط (یعنی نور) صبح (صادق) سے تمیز ہو جاوے سیاہ خط سے پھر صبح صادق سے رات تک روزہ کو

الصِّيَامِ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ

پورا کیا کرو اور ان بیویوں سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں تم لوگ اعتکاف والے ہو

فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرِبُوهَا كَمَا كَانَ يَبِينُ

مسجدوں میں - یہ خداوندی ضابطے ہیں سو ان سے نکلنے کے نزدیک بھومت ہونا اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور)

اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

احکام و بھی (لوگوں کی) ضابطے کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں میں میرے لوگ مطلع ہو کر ڈرنا اور پھر نہیں۔

روزہ کے مسائل "أَجَلٌ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَّتُ إِلَى نِسَائِكُمْ" یعنی جائز کر دیا گیا ہے تمہارے لیے



روزہ کی رات میں اپنی بیویوں سے ہم بستری کرنا۔ "الرَّفَثُ" سے آیت میں کناہہ جماع و ہم بستری سے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ "رَفَثٌ" سے مراد جماع ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کریم ہے، اور کناہہ و اشارہ کے الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ قتادہ، مجاہد، سالم بن عبد اللہ اور سدی رحمہم اللہ سے بھی یہی مفہوم نقل ہے۔ اس لفظ کے پہلی معنی "دو شہوت انگیز کلام" کے ہیں۔

"هَذَا لِبَاسٍ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لَبِاسٌ لَهَا" "تمہاری بیویاں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو" کے پہلی معنی تو ہے "وہ چیز جو پہنی جائے" آیت میں بیویوں کو ان کے شوہروں کا اور شوہروں کو ان کی بیویوں کا "لباس" کہنے کی وجہ بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ ایک ہی کپڑے میں وہ سو جاتے ہیں اور دونوں کا جسم ایک دوسرے سے اس طرح مل جاتا ہے گویا وہ ایک دوسرے کے لیے لباس ہیں۔ لباس بول کر کلام عرب میں بعض اوقات "جسم" بھی مراد لیتے ہیں، اور یہ استعمال اشعار عرب میں بھی پایا جاتا ہے یہی رحمة اللہ علیہ نے آیت کا مطلب بیان فرمایا کہ "تم ان کے لیے اور صفا ہو اور وہ تمہارے لیے اور صفا ہیں"۔

دوسرا قول اس سلسلے میں یہ ہے کہ "لباس" سے مراد باعث سکون ہے۔ ایک اور موقع پر یہی لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَجَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِبَاسًا" "تمہارے لیے رات کو لباس بنایا یعنی باعث سکون بنایا۔ چونکہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے باعث سکون ہیں، اس لیے انہیں ایک دوسرے کے لیے "لباس" کہا گیا۔ یہ مفہوم مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین سے نقل ہے۔ جو چیز کسی چیز کو چھپانے اور اس کی وجہ سے لوگ اسے نہ دیکھ سکیں اسے بھی "لباس" کہتے ہیں، یعنی وہ اس کے لیے پردہ بن گئی۔ آیت میں جو میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس کہا گیا ہے اس کا بھی مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے پردہ بن جاتے ہیں، یعنی وہ ایک دوسرے کے لیے باعث سکون ہیں، ایک دوسرے کے لیے پردہ پوش ہیں۔ مجاہد قتادہ، سدی، عبد الرحمن بن زید رحمہم اللہ سے آیت کی مذکورہ بالا تفسیر منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے "عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَى عَنْكُمْ فَالآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَأَبْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ" واللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا کرتے تھے، پس اس نے تم پر رحمت سے توبہ فرمائی اور تم سے درگزر کر دی، سو اب تم ان سے ملو بلاؤ اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ جس خیانت کا آیت میں ذکر ہوا ہے وہ دو چیزیں ہیں ہمہ تن تھی، ایک بیویوں کے ساتھ جماع اور دوسرے کھانے پینے میں، حالانکہ یہ چیزیں ان کے لیے اس وقت حرام تھیں۔ عبد الرحمن بن ابی لیلی بیان کرتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں ہر مہینے میں تین دن کے روزے تھے۔ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو سب دن اس پر عمل کر سکتے تھے، لیکن صورت یہ تھی کہ اگر افطار کے وقت کوئی شخص کھانا نہ کھا لیتا اور سو جاتا تو پھر اسے اگلے دن کے ختم ہونے تک کھانے کی اجازت نہیں تھی، اسی طرح افطار کے بعد اگر میاں بیوی میں سے کوئی بھی سو جاتا تو انہیں دوسرے دن کے ختم ہونے تک ہم بستری کی اجازت نہیں تھی۔ ایک مرتبہ ایک بوڑھے انصاری صحابی جن کا نام صرمہ بن مالک رضی اللہ عنہ تھا، آئے اور اپنی بیوی سے کھانا لانے کے لیے کہا، بیوی نے کہا کہ کھانا گرم کر لوں تو لاتی ہوں۔ اتنے میں ان صحابی رضی اللہ عنہ لگ گئی اور وہ سو گئے۔ دوسرا واقعہ عمر رضی اللہ عنہ کا پیش آیا آپ گھر میں آئے اور اپنی بیوی سے ہم بستری کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے کہا کہ میں سو چکی ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے

سمجھا کہ یوں ہی بہانہ کرتی ہیں اور آپ نے ان کے ساتھ ہم بستری کی۔ دونوں حضرات اپنے فضل پر رات بھر توبہ کرتے رہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس لغزش پر مطلع ہو گیا ہے، اب پہلا حکم بدل دیا جاتا ہے اور تم صبح صادق کے طلوع تک کھاپی سکتے ہو اور غورتوں کے ساتھ ہم بستری کر سکتے ہو۔ عبد الرحمن بن ابی لیبی، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، اگر افطار کے بعد کوئی سو لیتا تو اس کا دوسرے دن کا روزہ شروع ہو جاتا اور اس پر کھانا پینا اور دوسری تمام چیزیں جو روزہ دار نہیں کر سکتا، حرام ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ ابو ہریرہ نامی ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ اپنی زمین میں دن بھر کام کر کے ٹھکے ماندے آئے، لیکن نیند آگئی (اور کھانا نہ کھا سکے) صبح اٹھے تو شکستہ دکھائی دے رہے تھے صبح کو جب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا تو دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے، کیوں اتنے شکستہ حال نظر آتے ہو؟ انھوں نے اپنا واقعہ بیان کیا۔ ایک دوسرے صاحب غورت کے بارے میں خیانت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت برابر بن عازب، ابن عباس اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم سے بھی تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد دوسرے دن کا روزہ شروع ہو جاتا تھا، آپ نے فرمایا کہ کئی مسلمان کھانے اور غورتوں کے بارے میں رمضان کے چہینے میں عشاء بعد خیانت میں مبتلا ہوئے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے متعلق فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی طرح انھیں بھی اپنی بیوی کے ساتھ ابتلاء پیش آگیا تھا۔ مجاہد، قتادہ، سعدی، عطار، عکرمہ اور محمد بن یحییٰ رحمہم اللہ سے اس باب کی روایتیں سابق مضمون کی منقول ہیں۔

وَمَا شَرُّهُ، (جس سے کا شِرُّ وُحْشٌ بنا ہے) کلام عرب میں ”چمڑے کا چمڑے سے ملنا ہے“، آیت میں اس سے کنایہ جماع اور ہم بستری سے ہے۔ یہ مفہوم ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ کریم ہے اور وہ اس طرح کے مضمون کو کنایہ ہی میں بیان فرماتا ہے۔ عطار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں بھی ”مَا شَرُّهُ“ جماع کے لیے استعمال ہوا ہے اور قرآن مجید میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سعدی اور مجاہد نے کہا اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔

وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ، (اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھا یا ہے) کے مفہوم کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد ”اولاد“ ہے۔ مجاہد، عکرمہ، حسن، سعدی، نہ بیہ اور ضحاک بن مزاحم رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اس قول کی روایت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ”الیۃ القدر“ ہے۔ یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ”ہر وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے اور جس کی رخصت و اجازت دی ہے“ مراد ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فرمایا ہے ایک قرأت اس میں ”رَابْتَغُوا“ (بغیر واو) ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس اختلاف قرأت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ دونوں صحیح ہیں جس طرح چاہو پڑھو۔ میرے نزدیک اس آیت کی بہتر تفسیر یہ ہے کہ ”رَابْتَغُوا“ طلب و تلاش کرنے کے معنی میں ہے، یعنی تلاش کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھا یا ہے، مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لوج محفوظ ہیں لکھا یا ہے۔ وہ تمہارے لیے مباح و جائز ہے اس کی طلب و تلاش کرو۔ اس ذیل میں جماع کے ذریعہ بیچ کی طلب، لیلة القدر کی تلاش اور وہ تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے جائز و مباح کی ہیں آجاتی ہیں ان کے علاوہ آیت ان تمام معانی خیر کو حاوی ہے جو مطلوب ہیں اور انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے لوج محفوظ میں لکھ رکھی

ہیں۔ البتہ آیت سے مراد "اولاد" لینا آیت کی ترتیب اور اس کے الفاظ سے زیادہ قریب ہے۔ اس سے پہلے کے الفاظ میں جماع اور ہم بستری ہی کا ذکر ہے "اب ان سے مولاؤ" ، اس لیے اس کے بعد کے "اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے" سے اگر اولاد مراد لی جائے تو یہ زیادہ قرین قیاس ہے، خصوصاً ان دو دوسرے اقوال کے مقابلہ میں جو نہ آیت کی ترتیب سے واضح ہوتے ہیں اور نہ ان کی صحت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول ضامن ہے۔ "وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ" اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے، پھر روزہ کو رات ہونے تک پورا کرو) مفسرین کے اس باب میں مختلف اقوال نقل ہیں کہ "جب تک تم صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے" سے کیا مراد ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ "سفید خط" سے دن کی روشنی، سپیدہ صبح مراد ہے، اور "سیاہ خط" سے رات کی تاریکی مراد ہے۔ اس قول کی بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ روزے کے مہینہ میں رات میں کھاؤ پیو اور اولاد کی طلب میں اپنی بیویوں سے مباشرت کرو، رات کی ابتداء سے سپیدہ صبح کے نمودار ہونے تک یہ سب کچھ کرو، جب رات کی تاریکی سے صبح کا سپیدہ طلوع ہونے لگے تو پھر تمہارا روزہ شروع ہو جاتا ہے اور اب تم ان اعمال میں سے کوئی عمل نہ کرو۔ یہ قول حسن، سنی، قتادہ رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ قتادہ نے صبح کا ذب کا بھی ذکر کیا کہ طلوع صبح سے پہلے کچھ دیر کے لیے ایک سفیدی نمودار ہوتی ہے، اسے دیکھ کر یا کسی مؤذن کی اذان سن کر جو لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے دے رہا ہو، کھانے پینے سے نہ رک جاؤ بلکہ جب نور کا تڑکا دیکھ لو، جو صبح کا ذب کے کچھ دیر بعد ہوتا ہے اور روشنی شرقاً غرباً پھیلنے لگتی ہے تب کھانے پینے سے رک جاؤ اور روزہ شروع کر دو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قول نقل ہوا ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی تعلیم دی اور نماز کا طریقہ سکھایا کہ ہر نماز کو اس کے وقت میں کس طرح ادا کیا جائے۔ پھر فرمایا کہ جب رمضان آئے تو کھاؤ اور پیو جب تک کہ صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے پھر روزہ کو رات ہونے تک پورا کرو، لیکن میں اس کا مفہوم نہیں سمجھا اور میں نے دو دھاگے (خط) بنائے، ایک سفید اور ایک سیاہ اور صبح کے وقت انھیں دیکھتا رہا، لیکن اس وقت دونوں دھاگے یکساں ہی نظر آتے تھے۔ میں حضور اکرم ص کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ! آپ نے جتنی باتیں مجھے سکھائی تھیں وہ سب میں نے سمجھ لیں اور یاد کر لیں، لیکن "سفید خط اور سیاہ خط" کا مجھے مطلب سمجھ میں نہیں آیا؟ حضور اکرم ص نے فرمایا، ابن حاتم! کیا دشواری تمہیں پیش آئی اور آپ مسکرائے، جو کچھ میں نے کیا تھا غالباً آپ اسے سمجھ گئے تھے۔ میں نے عرض کی کہ میں نے دو دھاگے بنائے تھے، ایک سفید اور ایک سیاہ اور رات ہی سے انھیں دیکھنا شروع کر دیا تھا کہ دونوں میں جب امتیاز ہونے لگے تو کھانا پینا بند کر دوں) لیکن وہ یکساں ہی نظر آتے رہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر ہنس دیے اور آپ کے سامنے کے دندان مبارک دکھائی دیے، پھر فرمایا، کیا میں نے تم سے "مِنَ الْفَجْرِ" (صبح کا) بھی نہیں کہا تھا، اس سے مراد تو دن کی روشنی (سپیدہ صبح) اور رات کی تاریکی ہے!۔ سہل بن سعد سے روایت ہے کہ پہلے "مِنَ الْفَجْرِ" کے الفاظ نازل نہیں ہوئے تھے، بلکہ صرف یہ نازل ہوا تھا کہ "جب تک کہ تم پر سفید خط سیاہ خط نازل نہ ہو جائے" پھر کچھ لوگوں کو جب روزہ رکھنا ہوا تو انھوں نے سفید اور سیاہ دھاگے اپنے دونوں پاؤں میں باندھ لیے اور اس وقت تک کھاتے پیتے رہے جب تک دونوں دھاگے ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ

نے ”مِنَ الْفَجْرِ“ نازل کیا، یعنی صبح کا سفید خط رات کے سیاہ خط سے جب تک نمایاں نہ ہو جائے اس وقت تک کھانے پینے رہو۔ ان تمام حضرات کا جن کا قول اور پر مختلف روایتوں میں بیان ہوا یہ کہنا ہے کہ ”صبح کے سفید خط کا سیاہ خط سے نمایاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دن کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہو جائے۔ دن کی اس سفیدی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آسمان میں (شرقاً وغرباً) پھیل جاتی ہے اور راستوں اور کھلی جگہوں میں بھی نمایاں ہو جاتی ہے، اس سے پہلے ایک اور روشنی آسمان پر کچھ دیر کے لیے (شمال و جنوب میں) ظاہر ہوتی ہے، وہ یہاں مراد نہیں، وہ صبح کا ذب ہے۔ ابو مجلز، مسلم، عبدالرحمن بن ثوبان، جہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی روایت ہے۔ سمر بن جندب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمہیں بلال (رضی اللہ عنہ) کی اذان (جو طلوع صبح صادق سے پہلے رمضان میں خاص طور سے روزہ داروں کو متنبہ کرنے کے لیے دی جاتی تھی) اور طبی روشنی سحری کھانے سے نہ روک دے بلکہ وہ سپیدہ صبح مراد ہے جو افق میں پھیل جاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”سفید خط“ سے مراد سورج کی روشنی ہے، اور ”سیاہ خط“ سے مراد ”رات کی تاریکی“۔ ابراہیم تمیمی کہتے ہیں کہ میرے والد رضی اللہ عنہ کے ساتھ رمضان میں مدائن جا رہے تھے، جب صبح صادق ہو گئی تو آپ نے پوچھا، کیا تم میں سے کوئی کھانا پینا چاہتا ہے؟ ہم نے کہا کہ جس کا ارادہ روزہ رکھنے کا ہو گا وہ کھاپی نہیں سکتا۔ پھر ہم کچھ دُور تک چلے، اور جب فجر کی نماز کا آخری وقت ہو گیا تو آپ نے پھر پوچھا، تم میں سے کوئی سحری کھانا چاہتا ہے؟ ہم نے کہا کہ جسے روزہ رکھنا ہو گا وہ اب سحری نہیں کھائے گا۔ آپ نے فرمایا، لیکن مجھے روزہ رکھنا ہے اور میں اب سحری کھاؤں گا۔ چنانچہ آپ اترے اور سحری کھائی، پھر نماز پڑھی۔ علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ ہے وہ وقت جب ”صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جاتا ہے“۔ برابر بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رمضان کے مہینہ میں میں سحری کھا کر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، انھوں نے مجھ سے ایک مشروب پینے کی فرمائش کی۔ میں نے کہا کہ میں سحری کھا چکا ہوں۔ انھوں نے اصرار کیا تو میں نے پی لیا۔ پھر ہم باہر آئے تو لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ عامر بن مطر سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ان کے گھر حاضر ہوا، اپنی سحری انھوں نے میرے سامنے بھی پیش کی، چنانچہ ہم نے ان کے ساتھ کھایا، پھر نماز کی اقامت کہی گئی اور ہم نے باہر نکل کر نماز پڑھی۔ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے مولا سالم بیان کرتے ہیں کہ میں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک رمضان میں ایک ہی چھت پر رہتے تھے، ایک رات میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! کیا آپ سحری نہیں کھائیں گے؟ انھوں نے ہاتھ کے اشارہ سے مجھے رکنے کے لیے کہا۔ پھر دوبارہ میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! کیا آپ سحری نہیں کھائیں گے؟ آپ نے اس مرتبہ بھی مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ میں نے تیسری مرتبہ حاضر ہو کر پھر عرض کی اور اس مرتبہ انھوں نے فجر کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارہ سے مجھ سے رکنے کے لیے کہا۔ چوتھی مرتبہ جب میں حاضر ہوا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! کیا آپ سحری نہیں کھائیں گے؟ اس مرتبہ آپ نے طلب فرمائی اور کھایا۔ پھر دو رکعت (فجر کی سنت) پڑھی اور اس کے بعد نماز (فرض) کے لیے کھڑے ہوئے۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ نماز وتر کا وقت رات میں (آخری رات میں، جو اس کا افضل وقت ہے)، ہو اور سحری کا دن میں۔ لیکن خود ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ہی سے اس کے خلاف قول نقل ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ وتر اور سحری دونوں کا وقت رات میں ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ نماز وتر اور سحری کے درمیان میں اتنے وقت کا فاصلہ

ہونا چاہیے جتنا ثویب اور قامت میں ہوتا ہے۔ بہر حال اس قول کی تائید میں جو اقوال ہم نقل کر رہے تھے اس سلسلے میں جہان کی بھی ایک روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ سحری کھائی، فارغ ہو کر جب ہم باہر نکلے تو نماز کی اقامت ہو چکی تھی، چنانچہ ہم نے نماز پڑھی، ایک روایت میں جہان ہی سے منقول ہے کہ میں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر سے گذرا تو وہاں علی رضی اللہ عنہ سحری کھا رہے تھے، جب میں مسجد پہنچا تو نماز کی اقامت کہی گئی۔ ایک روایت میں ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد فرمایا کہ یہ ہے وہ وقت جب ”سیاہ خط سفید خط سے ممتاز ہوتا ہے“

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ روزہ کا وقت دن سے شروع ہوتا ہے، رات سے نہیں، اور ظاہر ہے کہ دن کی ابتداء سورج نکلنے سے ہوتی ہے، جیسا کہ دن کی انتہا سورج ڈوبنے پر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر دن کی ابتداء طلوع صبح صادق کو مان لیا جائے تو لازمی طور پر اس کی انتہا غروب شفق کو ماننی پڑے گی، لیکن اس سلسلے میں امت کا اجماع و اتفاق ہے کہ سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی دن ختم ہو جاتا ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سورج کے طلوع پر دن کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث نقل کی جاتی ہے کہ آپ نے طلوع فجر کے بعد سحری کھائی وہ ہمارے اس قول کی صحت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ چنانچہ زبیر بن جہش بیان کرتے ہیں کہ میں نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کیا آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں، پھر فرمایا کہ صرف سورج نہیں نکلا تھا، ورنہ جس وقت آں حضور کے ساتھ میں نے سحری کھائی اس کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ دن کا وقت تھا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر تم اذان کی آواز سنو اور کھانے کا برتن تہا ہاتھ میں ہو تو ضرورت کے مطابق کھانی کراٹھو۔ ایک روایت ہے کہ نماز کی اقامت کہی گئی اور برتن عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا، عرض کی، یا رسول اللہ! کیا میں اسے پی لوں؟ فرمایا، ہاں چنانچہ انہوں نے برتن کا مشروب پی لیا۔ بلال رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نماز کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوا، آپ کا ارادہ روزہ رکھنے کا تھا، چنانچہ آپ نے برتن منگوایا اور پیا، اور مجھے بھی عنایت فرمایا، میں نے بھی پیا، پھر آپ نماز کے لیے تشریف لائے میرے نزدیک ان دونوں تفسیروں میں وہ تفسیر مناسب و اولیٰ ہے جس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہے کہ ”سفید خط“ سے مراد دن کی سفیدی (سپیدۃ صبح) اور ”سیاہ خط“ سے مراد ”رات کی سیاہی“ ہے۔ کلام عرب میں بھی اس کا یہی مفہوم جانا پہچانا ہے۔ جو احادیث اس سلسلے میں اس طرح کی نقل کی جاتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سحری تناول فرمانے کے بعد نماز کے لیے تشریف لے گئے، یا پانی پینے کے بعد تشریف لے گئے تو اس سے اس قول کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ سحری آپ نے طلوع صبح صادق سے پہلے تناول فرمائی ہوگی، اسی طرح پانی بھی پہلے پیا ہوگا اور پھر نماز کے لیے تشریف لے گئے ہوں گے، یہ عین ممکن ہے، اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فجر کی نماز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح صادق کے طلوع کے فوراً بعد شروع ہو جاتی تھی اور اذان اس سے پہلے دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ آں حضور سحری اس وقت کھاتے تھے جب میں تیر گرنے کی جگہ کو دیکھ سکتا تھا، تو اس سے مراد بھی صبح صادق سے پہلے کا وقت لیا جاسکتا ہے۔

”سفید خط اور سیاہ خط“ کی تفسیر میں ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”سفید خط“ رات کے نیچے (آخری حصہ میں) ہوتا ہے اور وہ اس میں روشنی پیدا کر دیتا ہے، اور ”سیاہ خط“ رات کے اوپر (آخری حصہ سے پہلے) ہوتا ہے، اس کے بعد

”دَمِنَ الْفَجْرِ“ (صبح کا) کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ سفید خط اور سیاہ خط سے مراد وہ خطوط ہیں جو صبح صادق کے وقت نمایاں ہوتے ہیں، صبح صادق کا پورا وقت یہاں مراد نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جوں ہی صبح صادق کے آغاز میں سیاہ خط سفید خط سے نمایاں ہو جائے بس کھانا پینا چھوڑ دو اور روزہ شروع کر دو اور اس وقت سے رات تک روزہ پورا کرو جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے پہلے روزہ دار کے لیے کھانا پینا جائز ہے ان کی تردید خود اس آیت میں موجود ہے، کیونکہ آیت میں ”صبح“ کے سفید خط کے سیاہ خط سے نمایاں ہو جانے تک کھانے پینے کی اجازت ہے، اور کون نہیں جانتا کہ صبح کا سفید خط سیاہ خط سے ابتداء صبح صادق کا ہی ہے اور وقت نمایاں ہوتا ہے، جب رات کی سیاہی سپید صبح سے مغلوب ہونی شروع ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو کھانے پینے کی حد قرار دی ہے، یعنی کھانا پینا سپید صبح کے نمودار ہونے سے پہلے ختم کر دیا جائے، جو لوگ اس حد سے آگے بڑھ کر سورج نکلنے کو حد مانتے ہیں ان کے سامنے اگر کوئی یہ کہے کہ پھر دوپہر تک ہی کیوں نہ حد مان لی جائے، اور روزہ میں کھانا پینا بس اسی کے بعد ممنوع ہو، تو وہ ایسے شخص کو کسی دلیل سے قائل نہیں کر سکتے، کیونکہ انھوں نے خود ہی روزہ کے دنوں میں کھانے پینے کی اصل حد کو توڑ دیا ہے، اب جو چاہے گا اس اصل حد میں اضافہ کرتا رہے گا۔

”أَنْفَجِرُ“ مصدر ہے، اور تَفَجَّرَ انْمَاءً يَتَفَجَّرُ سے نکلا ہے، اس وقت بولتے ہیں جب پانی پھوٹ پڑے اور بہنے لگے، چوں کہ سورج کی آمد سے پہلے اس کی شعاعیں پھوٹ پڑتی ہیں اور ہر طرف اجالا ہی اجالا ہو جاتا ہے اس لیے اس وقت کو ”فجر“ کہا گیا۔ ”ثُمَّ آتَمُوا الصِّيَامَ إِلَى الدَّيْلِ“ میں روزہ کا آخر وقت بیان کیا گیا ہے، یعنی جس طرح روزہ کی ابتداء صبح صادق کے طلوع سے ہوتی ہے، جو دن کا ابتدائی وقت ہے، اسی طرح اس کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب رات شروع ہوتی ہے اور سورج ڈوب جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کا روزہ نہیں ہوتا، جس طرح روزے کے دنوں میں دن میں کھانا پینا وغیرہ نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی شخص رات دن متواتر روزے رکھتا ہے، وہ کوئی عبادت نہیں کرتا، بلکہ فاقہ کشی کرتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب رات آجائے، دن چلا جائے اور سورج ڈوب جائے تو روزہ دار روزہ توڑ لے۔ عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، آں حضور روزہ سے تھے۔ جب سورج غروب ہو گیا تو آپ نے ایک شخص سے فرمایا کہ اتر کر میرے لیے ستو گھول لو۔ انھوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! کاش آپ اور رات ہو لیتے دیتے! آں حضور نے پھر دوبارہ ان سے ستو گھولنے کے لیے کہا۔ انھوں نے وہی سابقہ جواب دیا، تیسری مرتبہ پھر آں حضور نے ان سے فرمایا اور انھوں نے وہی جواب دیا اور یہ بھی کہا کہ یا رسول اللہ، ابھی دن کے آثار باقی ہیں۔ تیسری مرتبہ آں حضور نے کہنے پر وہ اتر گئے اور آں حضور کے لیے انھوں نے ستو گھولا۔ اس کے بعد آں حضور نے فرمایا کہ جب رات ادھر سے نمودار ہو، آپ نے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا، تو روزہ دار کو روزہ کھول لینا چاہیے۔ رفیع نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ رات تک فرض کیا ہے، پس دن ڈوبنے کے بعد اگر تم چاہو تو کھاؤ اور چاہو نہ کھاؤ۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے صوم وصال (مسلل کی دن و رات درمیان میں بغیر کچھ کھانے پینے روزہ رکھنا) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر صرف دن کے روزے فرض کیے ہیں، اس لیے جب رات آئے تو کھائے اور چاہا نہ کھائے، بہر حال رات کے وقت روزہ نہیں ہوتا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ صوم وصال شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔

اس کے باوجود بہت سے اکابر امت سے صوم وصال ثابت ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ سات سات دن رات مسلسل، درمیان میں کچھ کھائے پیے بخیر، روزہ رکھتے تھے، جب آپ بوڑھے ہو گئے تو پانچ پانچ یوم صوم رکھتے، پھر جب اور بوڑھے ہو گئے تو گھٹا کرتے دن کر دیا تھا۔ ابن ابی یحییٰ مہینہ بھر میں ایک مرتبہ روزہ کھولتے تھے۔ عامر بن عبداللہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ رمضان میں سولہ سولہ اور سترہ سترہ دن میں روزہ کھولتے۔ اس روایت کے راوی مالک رحمۃ اللہ علیہ ہیں، آپ نے بیان کیا کہ میں نے ان سے پوچھا، ابواحارث! آپ کس طرح مسلسل اتنے دن، کھائے پیے بغیر رہ جاتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں گھی پی لیتا ہوں اور اس سے میری رگیں تریبتی ہیں۔ اس طرح کی مثالیں بکثرت ہیں، لیکن اس کی وجہ طاعت و عبادت نہیں، بلکہ نفس کشی اور بھوکے رہنے کی قوت حاصل کرنا مقصود ہوتا تھا، خود وہ اکابر بھی یہ عمل طاعت و عبادت سمجھ کر نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثال عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں ملتی ہے، آپ لوگوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ زندگی موٹی چھوٹی گزارو، تکلفات کے عادی نہ بنو۔ گھوڑے پر کود کر چڑھا کرو اور سفر ہمیشہ سواری ہی پر نہیں بلکہ پیدل بھی کیا کرو۔ عمر رضی اللہ عنہ کا اس ارشاد سے مقصد یہی تھا کہ لوگ آرام پسند نہ بن جائیں، بلکہ سخت کوشی کی زندگی اختیار کریں اور اپنے آپ کو مشکلات کا ہر وقت سامنا کرنے کے لیے تیار رکھیں۔ اس کے باوجود بہت سے اہل علم و فضل نے صوم وصال، یعنی کئی کئی دن رات بعد روزہ کھولنے کو پسند نہیں کیا ہے۔ ابن ابی نعیم کے متعلق روایت ہے کہ وہ کئی کئی دن بعد روزہ کھولتے، اور اس دوران میں یہ حالت ہو جاتی کہ اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ عمر بن میمون رحمۃ اللہ علیہ کو جب ان کے متعلق معلوم ہوا تو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو اگر یہ شخص مل جاتا تو اسے رحم کر دیتے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں تو اتر کے ساتھ صوم وصال کی مانعت آئی ہے، مثال کے طور پر ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ نے صوم وصال سے منع فرمایا۔ صحابہؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ! آپ تو صوم وصال کرتے ہیں۔ آں حضورؐ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میری حالت تمہاری جیسی نہیں ہے، مجھے رات کے وقت (اللہ کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔ البتہ ایک سحری سے دوسری سحری تک کے روزہ کی اجازت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ نے فرمایا، صوم وصال نہ کرو، اور اگر کسی کو کرنا ہی ہے تو بس سحری تک کی اجازت ہے (یعنی افطار کے وقت اگر نہ کھائے پیے تو سحری کے وقت ضرور ہی کھا لینا چاہیے)۔ صحابہؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ! آپ تو صوم وصال کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں جیسا نہیں ہوں، رات کے وقت مجھے ایک کھلانے والا کھلاتا ہے اور پلانے والا پلاتا ہے۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی ام ولد (باندی) سے روایت ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں گئیں تو آپ سحری کھا رہے تھے، آپ نے کھانے پر انہیں بلایا تو انہوں نے کہا کہ میں روزہ سے ہوں پھر انہوں نے اس کی صورت بتائی۔ آں حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ اگر صوم وصال ہی رکھنا ہے تو آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سحری کے وقت سے سحری کے وقت تک رکھ لیا کرو۔ اس لیے ”اتِمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ“ کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر جن امور سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں صبح کے سفید خط کے سیاہ خط سے نمایاں ہو جانے پر روکا ہے ان سے رات تک رُکے رہنے کو پورا کرو۔ اس کے بعد پھر صبح صادق کے طلوع ہونے تک کھانا پینا تمہارے لیے جائز ہے۔ ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ

سے یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔

”وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ“ یعنی جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کیے ہوئے ہو، اس حال میں اپنی بیویوں سے صحبت نہ کرو۔ ”عکوف“ (جو عَاكِفُونَ کا ماخذ ہے) کی حالت وہ حالت ہے جب بندہ اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں اپنے کو روکے رکھتا ہے۔ ”عکوف“ کا اصل مفہوم ٹھہرنا، اور کسی چیز پر اپنے آپ کو روکے رکھنا ہے۔ مفسرین سے ”مباشرت“ (جو تَبَاشِرُوهُنَّ کا ماخذ ہے) جس سے اللہ نے آیت میں روکا ہے کے مفہوم کے سلسلے میں کئی اقوال نقل ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد صرف جماع اور ہم بستری ہے، مباشرت کے اور جو مفہوم ہو سکتے تھے وہ آیت میں مراد نہیں ہیں۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ رمضان المبارک کا مہینہ ہو یا کوئی اور مہینہ، حالت اعتکاف میں، دن یا رات کوئی بھی وقت ہو، عورتوں کے ساتھ ہم بستری نہ کرنی چاہیے۔ عطار، ضحاک، ربیع، قتادہ، سدی اور مجاہد جہم اللہ سے بھی یہ قول نقل ہے۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ قضاہ حاجت وغیرہ کے لیے معتکفین اپنے گھر جایا کرتے تھے، اور گھر ہی میں اپنی بیویوں سے ہم بستری بھی کر لیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسی سے آیت میں روکا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ میں نے عطار رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد میں اپنی بیوی کو بوسہ یا اسے چھونے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ حرام تو ہم بستری ہی تھی ہے، لیکن اس طرح کی کوئی چیز بھی مسجد میں پسند نہیں کرتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن پر ”مباشرت“ کا مفہوم حاوی ہے، مثلاً عورت کو بوسہ دینا، چھونا، ہم بستری کرنا۔ چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ حالت اعتکاف میں بوسہ وغیرہ کی طرح کی کسی چیز کے ذریعہ عورت سے لذت نہ حاصل کرے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”مباشرت“ میں جماع اور غیر جماع تمام چیزیں آجاتی ہیں اور معتکف کے لیے سب حرام ہیں، وہ مباشرت جس میں ہم بستری نہ ہو اس میں کوئی بھی ایسی صورت آجاتی ہے جس میں مرد کا چھڑا عورت کے چھڑے سے چھو جائے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ”مباشرت“ کا ایک عام لفظ ذکر کیا ہے اور حالت اعتکاف میں اس سے روکا ہے، اس کی کوئی تخصیص نہیں کی کہ فلاں قسم کی مباشرت تو جائز ہے اور فلاں قسم کی جائز نہیں، اس لیے اس لفظ کے مفہوم میں جتنی چیزیں بھی آتی ہیں ان سب ہی سے آیت میں ممانعت سمجھی جائے گی۔

میرے نزدیک پہلا قول راجح ہے، یعنی آیت میں ”مباشرت“ سے مراد جماع، ہم بستری یا کوئی بھی ایسا عمل جو جماع کے قائم مقام ہو، یعنی جس کے کرنے سے غسل ضروری ہو جاتا ہو۔ آیت کی تفسیر میں صرف یہی دو اقوال ہیں، یعنی ایک قول کے مطابق حکم عام ہے اور دوسرے کے مطابق مباشرت کا ایک خاص مفہوم مراد ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ بہت مضبوط اور متواتر روایات کے ذریعہ یہ حدیث ثابت ہے کہ ازواج مطہرات اس وقت بھی آپ کو کنگھا کیا کرتی تھیں جب آپ حالت اعتکاف میں ہوتے تھے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ آیت میں ”مباشرت“ کا لفظ اپنے عام اور وسیع مفہوم میں نہیں استعمال ہوا ہے، بلکہ ایک مخصوص صورت ہی مراد ہے جس کے لیے یہ لفظ عام طور سے استعمال ہوتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں ہوتے، اور مسجد ہی میں سے اپنا سر میری طرف کر دیتے اور میں اپنے حجرہ میں بیٹھے بیٹھے آپ کے سر مبارک میں کنگھا کر دیتی۔ آپ نے بیان کیا



کہ جب آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم معتکف ہوتے تو گھر میں صرف قضاہ حاجت کے لیے تشریف لاتے۔ ایک روایت میں ہے کہ میں حاضر ہوتی اور اسی حالت میں سر مبارک کو دھوتی اور اس میں کنگھا کر دیتی۔ اس صحیح حدیث کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ آیت میں "مباشرت" سے مراد اس کا عام اور وسیع مفہوم ہے۔ لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ اس لفظ سے مراد اس کی ایک خاص صورت ہے جس میں یہ لفظ عام طور سے استعمال ہوتا ہے یعنی جماع یا کوئی بھی ایسا عمل جو لذت میں اس کے قائم مقام ہو اور اس سے غسل واجب ہو جاتا ہو۔

"تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا" وہ چیزیں جن کا ذکر اس سے پہلے ہوا، یعنی رمضان کے مہینہ میں دن میں کھانا پینا، جماع کرنا، یا حالت اعتکاف میں جماع کرنا، ارشاد ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے میں نے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے ان کے قریب بھی نہ جانا، اس سے دور ہی دور رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے ان ضابطوں کو توڑ بیٹھو اور پھر سزا کے مستحق قرار پاؤ، اور ان لوگوں کی صف میں کھڑے کیے جاؤ جو میرے ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے والے اور نافرمان ہیں۔ مفسرین "حُدُودُ اللَّهِ" کا مفہوم "اللہ کے ضابطے" کہتے ہیں اور میں نے آیت کا جو مطلب لکھا ہے وہ بھی اس سے قریب ہے، بلکہ اس سے زیادہ چچا تلا ہے۔ کسی چیز کی "حد" اسے کہتے ہیں جو گھری ہوئی ہو اور اس طرح اس حد اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کے درمیان امتیاز پیدا کر دیا گیا ہو، اس لیے آیت میں "تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ" میں اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جو حلال چیزوں سے صاف طور پر ممتاز ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حدود اور ان کی صفات و خصوصیات کھول کر بیان کر دی ہیں۔ "حُدُودُ" کے معنی "شروط" (ضابطے) سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔ لیکن ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے "حُدُودُ" کے معنی "اللہ کی نافرمانی" منقول ہیں۔ "كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لِّلنَّاسِ لَعَنَهُمْ يَتَّقُونَ" ارشاد ہے کہ اے لوگو! جس طرح میں نے تمہارے لیے روزہ کی فرضیت کے متعلق صاف طور پر بیان کر دیا، اس کے حدود و اوقات بھی تمہیں مجھ سے معلوم ہو گئے اور اس کی رخصتوں کا بھی علم ہو گیا، اسی طرح میں اپنے تمام احکام، جن کا تعلق میرے حلال و حرام، میرے حدود و ضوابط اور میرے حکم و منع سے ہے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہوں، اور یہ تمام احکام میں اس لیے بیان کرتا ہوں تاکہ وہ میری نافرمانی اور میری معصیت سے بچیں اور اپنے آپ کو میرے غضب و غصہ کا مورد نہ بنائیں۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآئِلِ الْحُكْمِ لِنَا كُلُوا

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق دھور پر مت کھاؤ اور ان کے جھوٹے مقدمہ کو احکام کے بیان اس غرض سے جمع مت کرو کہ

فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

(اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ اور تم کو اپنے جھوٹ اور (ظلم کا) علم بھی ہو۔

یعنی ایک دوسرے کے مال ناجائز طور پر مت کھاؤ۔ آیت میں "أَمْوَالِكُمْ" دہنہارا اپنا مال کہا گیا ہے، حالانکہ مراد دوسروں کا مال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بھائی کا مال ناجائز طور پر مضم کر جانے کو اپنے ہی مال کے ناجائز استعمال کی طرح قرار دیا ہے۔ یہ طرز خطاب قرآن مجید میں بکثرت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کے

درمیان بھائی چارگی اور اخوت قائم کی ہے اس لیے اپنے بھائی کو قتل کرنے والا گویا خود اپنا ہی قاتل ہے، اپنے بھائی کی بدگوئی کرنے والا اپنی ہی بدگوئی کرنے والا ہے۔ کلام عرب میں بھی یہ استعمال عام تھا کہ اپنے بھائیوں کی چیزوں کو لوگ اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے اور اپنی چیزوں کو اپنے بھائیوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ ”آپس میں تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ“۔ ”اکل بالباطل“ (ناجائز طور پر کھانے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا استعمال اور اس میں تصرف میں تصرف تمہارے لیے جائز نہیں کیا ہے، لیکن تم اس کے باوجود اسے استعمال کرو۔

”تُدُّوْا بِهَا إِلَى الْحُكْمِ“ اور نہ ناجائز طور پر اپنے کسی بھائی کا مال اڑا لینے کے لیے حکام تک مقدمے لے جاؤ، یعنی ”نہ اسے حکام تک پہنچاؤ، تاکہ اس ذریعے سے لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم حرام طریقے سے کھا جاؤ“۔ ”بِالْإِشْرَافِ“ سے مراد حرام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حرام کیا ہے

”وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ یعنی وراں حالے کہ تم یہ سب کچھ جان بوجھ کر کرو اور حکام تک مقدمہ کو لے جانے کا مقصد ہی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز تمہارے لیے حرام کی ہے اور جو تمہارے بھائی کی ہے اسے اپنی بناو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایسے شخص کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس پر اس کے کسی بھائی کا مال ہو، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہ ہو، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مال کا انکار کر دے۔ حق اس کے سامنے واضح ہے اور جانتا ہے کہ یہ مال اس طرح اس کے لیے حرام ہے، لیکن اس کے باوجود حکام تک معاملہ لے جانے میں بھی اسے کوئی تاثر نہیں، کیونکہ اسے اطمینان ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ظالم ہوتے ہوئے حکام تک معاملہ نہ لے جاؤ کہ تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ قاضی (جج) کا فیصلہ کسی حرام چیز کو حلال یا کسی حلال چیز کو حرام نہیں بنا سکتا، قاضی تو قانون اور گواہی کی مضبوطی اور کمزوری کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا ہے، وہ ایک انسان ہے، اور جس طرح صحیح فیصلے کر سکتا ہے اسی طرح اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے، اس لیے یاد رکھو کہ اگر اس نے کسی کے حق میں غلط فیصلہ کر دیا ہے تو ابھی مقدمہ ختم نہیں ہوا، اس کا آخری فیصلہ باقی ہے اور اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن سب کو جمع کرے گا اس وقت وہ حق و باطل کا صحیح فیصلہ فرمائے گا اور اگر کسی نے دنیا میں دلائل و شواہد کے زور سے غلط فیصلہ اپنے حق میں کروا لیا ہے تو اس دن حق والے کو اس کا حق ملے گا اور یہ حق اسی شخص سے وصول کیا جائے گا جس نے اپنے لیے ناجائز فیصلہ کروا لیا تھا۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ”بالباطل“ سے مراد تو یہ ہے کہ ایک شخص خود اپنے ساتھ ہی پر ظلم کرتا ہے اور پھر خود ہی حکام تک مقدمہ لے جاتا ہے، اسے معلوم ہے کہ ظلم وہی کر رہا ہے لیکن مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اپنے ساتھ ہی کا مال خود مضمم کر جائے۔ یہی چیز ”تُدُّوْا بِهَا إِلَى الْحُكْمِ“ میں بیان کی گئی ہے۔

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جو ہے جس پر اہل جاہلیت کا عمل تھا۔ ”ادلاء“ (جو متدلوں کا ماخذ ہے) کا اصل مفہوم ہے ”ڈول کو کسی رسی وغیرہ میں باندھ کر کنویں میں لٹکانا“ اسی سے اپنے دعویٰ پر دلائل دینے والے کے لیے ”أَدْلَى بِحُجَّةٍ كَيْتٌ وَ كَيْتٌ“ یعنی اس نے اپنے دعوے کے لیے فلاں فلاں دلائل دیئے۔ کیونکہ دلائل بھی اس کے لیے وسیلہ اور سبب ہیں، اور انھیں کے ذریعہ وہ اپنے مقدمہ کی رسی کو دراز کرتا ہے تاکہ مقصد حاصل ہو جائے جس طرح کنویں سے پانی نکالنے والا ڈول کو رسی وغیرہ کے ذریعہ جو پانی نکالنے کا وسیلہ اور سبب ہیں کنویں میں ڈالتا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلَةِ طُقُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط وَ لَيْسَ

آپ سے چاندوں کی حالت صحیحاً کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ وہ چاند آدھ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے اختیاری معاملات مثل عدو مطالبہ

الْبُرْيَانُ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبُرْمَانَ اتَّقَى وَ

حقوق کے اور غیر اختیاری عبادات مثل حج روزہ و زکوٰۃ وغیرہ کیلئے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھر و نہیں انکی پشت کی طرف سے آیا کرواں لیکن فضیلت ہے کہ

اتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

کوئی شخص حرام چیزوں سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو

چاند کی پیدائش کے چند مقاصد

”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلَةِ طُقُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط“ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے مختلف احوال کے متعلق سوال

کیا گیا تھا کہ کیوں چاند بالکل باریک ہوتا ہے، اور پھر خود ہی بڑھتے بڑھتے بدر کمال کیسے بن جاتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے متعلق پوچھا تھا کہ آخر اس میں یہ مختلف احوال کیوں رکھے گئے ہیں؟ جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ یہ لوگوں کو روزے، افطار، مناسک حج اور عدت کے اوقات بتانے کا آلہ ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے دینی امور میں اس کے ذریعہ لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیں، یہ روایت ربیع، ابن جریر، سعدی اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے، ابن عباس اور علی رضی اللہ عنہما نے بھی فرمایا ہے۔ اس قول کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے محمد! لوگ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنی ایک حالت پر کیوں نہیں رہتا، کیوں کبھی باریک ہوتا ہے اور کبھی بدر کمال، کبھی آسمان پر جلوہ نمائی کے لیے موجود اور کبھی ردپوش!۔ آخر اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند میں فرق کیوں رکھا ہے کہ اول الذکر تو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا ہے، لیکن چاند کی رگ و پے میں تغیر پذیری سمودی گئی تو آپ اس کا جواب دے دیجئے کہ ان دونوں کے حالات میں یہ فرق تمہارے رب نے منصلحت اور حکمت کے پیش نظر کیا ہے تم اس کے ذریعے مہینے کے مختلف دن اور رات کے مختلف اوقات معلوم کر سکتے ہو، اور اس طرح روزہ، افطار، قرض کی ادائیگی کا وقت، عورتوں کی عدت کا وقت، حج کے اوقات وغیرہ تمہیں اس کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ ”وَالْحَجِّ ط“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے حج کے اوقات معلوم کرنے کا بھی ذریعہ بنایا ہے، اس کے ذریعے تمہیں اپنے مناسک کا علم ہوتا ہے۔

طاعت کی روح تقویٰ ہے

”وَلَيْسَ الْبُرْيَانُ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبُرْمَانَ اتَّقَى وَ الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت ایسے

لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حالت احرام میں گھروں کے اندر دروازے سے نہیں آتے تھے۔ چنانچہ برابر بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار اسلام سے پہلے جب حج کرتے اور واپس آتے تو گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہوتے تھے۔ پھر ایک انصاری حج کر کے آئے اور دروازے سے گھر میں داخل ہو گئے تو لوگوں نے اس رسم شکنی پر شکہ چینی کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ”طاعت یہ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا جائے، بلکہ طاعت گزار بندہ وہ ہے جو

تقریبی اختیار کرے اور فطری طریقہ کے مطابق گھروں میں دروازوں ہی کے ذریعہ داخل ہو۔ قیس بن جبیر کی روایت میں ہے کہ کچھ لوگ دروازے سے اندر نہیں داخل ہوتے تھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب گھر میں دروازے سے داخل ہوئے۔ رفاعہ بن تابوت نامی ایک انصاری صحابی تھے، انھوں نے جب آنحضرت کو دروازے سے آتے جاتے دیکھا تو وہ بھی آنحضرت کے پیچھے دروازے ہی سے باہر نکلے۔ آنحضرت نے ان سے پوچھا کہ تمہارے یہاں تو یہ دستور نہیں، تم ہمارے ساتھ دروازے سے کیوں آتے جاتے ہو۔ انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے آپ کو اسی طرح آتے دیکھا اس لیے میں نے بھی آپ کی اتباع کی۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ برابر بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیت کا جو شان نزول بیان کیا گیا وہی مجاہد، ابراہیم، قتادہ، سدی، ربیع اور ابن جریر رحمہم اللہ سے بھی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مدینہ کے کچھ قبائل میں یہ دستور تھا کہ جب انھیں کسی دشمن کا خوف ہوتا تو وہ احرام باندھ لیتے تھے، تاکہ امن حاصل ہو جائے۔ ایسی حالت میں وہ گھر کے دروازے سے آمد و رفت نہیں رکھتے تھے، بلکہ پشت کی طرف دیوار میں نقب ڈال لیتا، اور آنا جانا اسی سے رکھتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں اسی طرح کے محرم ایک صاحب اس وقت تھے۔ حضور اکرم ایک باغ میں دروازے سے داخل ہوئے، اور وہ صاحب بھی جو احرام باندھے ہوئے تھے آپ کے پیچھے پیچھے دروازے سے ہی اندر گئے پیچھے سے ایک شخص نے پکار کر کہا کہ لے فلاں، تم تو محرم ہو اور اس کے باوجود دروازے سے باغ میں جا رہے ہو، باغ چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو قریشی ہوں، پھر انھوں نے حضور اکرم سے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ محرم ہیں تو میں بھی محرم ہوں، اگر آپ قریشی ہیں تو میں بھی قریشی ہوں، کہ میرا دین وہی ہے جو آپ کا ہے۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کے لیے حالت احرام میں دروازے سے گھر میں داخل ہونا جائز قرار دیا گیا۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ ہے کہ اہل مدینہ اور ان کے علاوہ بعض اور قبائل حالت احرام میں گھر کے اندر دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ پشت کی طرف دیوار پھاند کر اندر آتے۔ لیکن حضور اکرم ایک دن ایک انصاری صحابی کے گھر میں دروازے سے داخل ہوئے۔ آپ کے پیچھے ایک دوسرے انصاری صحابی بھی، جو احرام باندھے ہوئے تھے، دروازے ہی سے داخل ہوئے۔ لوگوں نے انھیں ملامت کرنی شروع کی اور کہا کہ تم فاجر ہو۔ آنحضرت نے بھی ان سے پوچھا کہ محرم ہونے کے باوجود تم دروازے سے کیوں داخل ہوئے؟ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نے آپ کو اسی طرح داخل ہوتے دیکھا اس لیے میں نے بھی آپ کی اتباع کی، آنحضرت نے فرمایا کہ میں تو قریش کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ انصاری صحابی نے عرض کی، لیکن میرا اور آپ کا دین تو ایک ہی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کوئی طاعت نہیں ہے کہ احرام کی حالت میں تم دروازوں کے بجائے پشت کی طرف سے گھر میں داخل ہو، بلکہ طاعت گزار بندہ وہ ہے جسے اللہ کا خوف ہو، وہ اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچے، جن چیزوں کا اس نے حکم دیا ہے انھیں بجالائے۔ پشت کی طرف سے گھر میں آنے کی مشکلات برداشت کرنا اللہ کی کوئی طاعت نہیں ہے، گھر میں اسر راستے سے داخل ہو جس سے تمہیں آسانی ہو۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، یعنی اے لوگو! اللہ سے ڈرو، اس کے احکام کو بجالاؤ، جن امور سے اس نے تمہیں روک رکھے اس سے رک جاؤ، تاکہ تمہیں کامیابی اور فلاح حاصل ہو اور تم اس کی ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں کو پاسکو۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

اور بے تکلف) تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو نقص عہد کر کے تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد (معاہد) سے نہ نکلو۔

المُعْتَدِينَ ○ وَقَاتِلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ

اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور جس حالت میں وہ خود تمہاری دشمنی کریں اس وقت (خواہ) انکو قتل کر دو جہاں نکلویاؤ اور (خواہ) انکو گال

أَخْرِجُوهُمْ وَالْفِتْنَةَ أَشَدَّ مِنَ الْقَتْلِ ○ وَلَا تَقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ

باہر کرو جہاں سے انہوں نے تم کو نکلنے پر مجبور کیا ہے اور شرارت قتل سے بھی سخت تر ہے اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (دو نواح) میں رکھ کر کہلاتا

الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ○ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَأَقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ

ہے (قتال مت کرو۔ جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔ ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو تم (بھی) انکو مار لیے

جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ○ فَإِنْ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ لوگ اپنے کفر سے باز آجاویں (اور اسلام قبول کر لیں) تو اللہ تعالیٰ بخشتی ہے گا اور مہربانی فرمائیگا

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ○ فَإِنْ انْتَهَوْا

اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد عقیدہ (شرک) نہ رہے اور ان کا دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جاوے اور اگر وہ لوگ کفر سے باز

فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ○

آجاویں تو سختی کسی پر نہیں ہو کرتی بجز بے انصافی کرنے والوں کے۔

اپنا دفاع کرو لیکن کسی پر ظلم نہ ہونے پائے

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ○  
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ○

کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ سب سے پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو مشرکوں کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اس میں مسلمانوں کو حکم ہے کہ جو مشرکین جنگ کریں تو مسلمان بھی ان کا بھر پور جواب دیں، لیکن جو آمادہ مخالفت نہیں ہیں انھیں مسلمان بھی نہ چھیڑیں پھر یہ حکم سورہ براءہ کی آیات سے منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم مدینہ میں نازل ہوا تھا۔ ربیع اول

ابن زبیر جہا اللہ سے یہی قول منقول ہے۔  
دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ نہیں ہوا، کفار سے جن حالات میں جنگ کرنے کا حکم آیت میں ہے وہ اب بھی موجود ہے۔ آیت میں اعتدال سے جو روکا گیا ہے (ولا تعتدوا) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ میں عورتوں، بچوں اور معذور لوگوں کو مت قتل کرو۔ اور یہ حکم آج بھی قائم ہے، اس لئے آیت کا کوئی جز بھی کسی آیت سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔ یہ قول عمر بن عبدالعزیز، مجاہد اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور یہی قول میرے نزدیک راجح ہے۔ نسخ کی

کوئی دلیل نہیں ہے، آیت میں جو احکام ہیں وہ سب اب بھی نافذ ہیں۔ اس تفسیر کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے مسلمانو! جو کفار تم سے آمادہ جنگ ہوں ان سے میری طاعت میں، میری رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور میرے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق لڑو، لیکن جو لوگ لڑنے کے قابل نہیں ہیں، یعنی کفار کی عورتیں بچے وغیرہ انھیں قتل مت کرو، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز ہے، اور اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

”وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ“، یعنی اے مسلمانو! جو مشرکین تم سے جنگ کریں ان کے جنگ کے قابل آدمیوں کو تم جہاں بھی پاؤ اور تمہیں موقع مل جائے تو قتل کر دو۔ ”حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ“ کا یہی مفہوم ہے ”التقفية بالامر“، کا مفہوم ہوتا ہے ”اس معاملہ میں خداقت و بصیرت“، جنگ کے سلسلے میں اس لفظ کے استعمال سے مطلب ”معاملات جنگ میں جہارت و کامل بصیرت“ ہوگا، اس طرح ”وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ“ کا مطلب یہ ہوگا کہ ”جہاں تم ان پر قابو پاؤ اور جنگی نقطہ نظر سے ان کا قتل وہاں مناسب ہو تو انھیں جانے نہ دو، ضرورت قتل کر ڈالو“ اور ”أَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ“ میں اشارہ ہاجرین کی طرف ہے کہ ان کے وطن مکہ معظمہ سے انھیں نکالا گیا تھا، ارشاد ہے کہ جو مشرکین تم سے جنگ کرتے ہیں اور اس سے پہلے انھوں نے تمہیں تمہارے وطن سے نکال دیا تھا، تمہیں گھر سے بے گھر بنا دیا تھا انھیں تم بھی نکال باہر کرو۔

”وَأَقْبَتْنَا أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“ اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین ہے۔ ”فتنہ“ سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہے۔ اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ ”فتنہ“ کے اصل معنی آزمائش اور ابتلا کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مومن کا اس کے دین کے بارے میں ابتلا، اور اس حد تک کہ وہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد شریک میں مبتلا ہو جائے اس کے حق میں اس سے زیادہ سنگین اور زیادہ نقصان دہ ہے کہ وہ اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے قتل کر دیا جائے۔ مجاہد، قتادہ، ربیع، ضحاک اور ابن زبیر رحمہم اللہ سے منقول تفسیر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

”وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَمَا كَذَّبْنَا جَزَاءُ الْكَافِرِينَ“ آیت کی قرارت دو طرح کی گئی ہے۔ مدینہ اور مکہ زاد اللہ شریفیہا کے اکثر قاری تو اسی مشہور و معروف قرارت کے مطابق پڑھتے ہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! مسجد حرام کے قریب حدود حرم میں مشرکوں کے ساتھ جنگ کی ابتداء نہ کرو۔ لیکن اگر وہ ابتداء کریں اور اقدام جنگ چھیڑ دیں تو تم اپنا بھر پور دفاع کرو اور انھیں قتل کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر اور برے اعمال کا بدلہ دنیا میں قتل اور آخرت میں ہمیشہ کی رسوائی مقرر کر دیا ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے اسی کے مطابق تفسیر نقل ہے۔ آپ حضرات کی رائے ہے کہ پھر یہ حکم اس کے بعد کی آیت ”اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے“ سے منسوخ ہو گیا، یعنی بعد میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا کہ حدود حرم میں بھی آپ مشرکین مکہ سے جنگ کر سکتے ہیں تاکہ وہ کلمہ توحید کا اقرار کر لیں۔

اسی قرارت کی بناء پر دو سراقول یہ ہے کہ آیت کا حکم منسوخ نہیں ہے، بلکہ یہ آیت بھی دوسری آیتوں کی طرح محکم ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آں حضور کو آیت میں حکم ہے کہ اگر مشرکین حدود حرم میں آپ سے جنگ کی ابتداء کریں تو آپ بھی وہیں اپنا دفاع کریں اور انھیں قتل کرنے سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ بچکی پائیں، لیکن جنگ کی ابتداء حدود حرم میں آپ کی طرف سے نہ ہونی چاہیے۔

آیت کی قرارت کوفہ کے اکثر قاری اس طرح کرتے ہیں "لَا تَقْتُلُوا هُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقْتَلُوا كَمَا فِيهِ فَإِنْ قَتَلُوا كَمَا قَاتَلُوا هُمْ" مطلب یہ ہے کہ حدودِ حرم میں قتل کی ابتداء تم نہ کرو، جب تک وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کریں۔ اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قرارت منقول ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اگر آیت کی قرارت کے مطابق سب مسلمان پہلے قتل ہو لیں، پھر کون کفار کو قتل کرے گا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص بھی قتل ہو جاتا یا اسے چوٹ آجاتی تو اس کی قوم ولے جمع کے صیغے کے ساتھ کہتے کہ "قَتَلْنَا، ضَرَبْنَا" رہیں قتل کر دیا گیا، ہمیں مارا گیا۔

میرے نزدیک راجح قرارت پہلی ہی ہے، اور یہ کہ یہ حکم اس کے بعد کی آیت سے منسوخ ہو گیا تھا۔ اس کی تائید میں بعض اقوال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ایک اور روایت میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

"وَإِنْ أَنْتُمْ هُمْ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ" یعنی کفار جو آپ سے جنگ کرتے ہیں، اگر اپنی اس جنگ بازی اور کفر سے باز آجائیں اور صدق دل سے توبہ کر لیں تو اللہ ان لوگوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے جو ان میں سے ایمان لائیں، شرک سے توبہ کر لیں اور اپنے تمام کچھلے گناہوں کے لیے اللہ کی طرف رجوع کریں، اور اللہ اپنے افضال و انعامات کے ذریعہ آخرت میں ان پر رحم کرنے والا ہے، آخرت میں انہیں بھی وہ سب کچھ ملے گا جو طاعت گزار بندوں کو ملتا ہے۔ "وَقَاتِلُوا هُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ" اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ جو مشرکین آپ سے جنگ کرتے ہیں ان سے آپ بھی جنگ کیجئے، تاکہ فتنہ باقی نہ رہے "فتنہ" سے مراد وہی "اللہ کے ساتھ شرک" ہے، یعنی یہاں تک کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، بتوں کے پوجنے کا سلسلہ ختم ہو جائے اور عبادت و طاعت صرف اللہ کی ہونے لگے۔ قتادہ، مجاہد، سدی، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے "فتنہ" کا معنی "اللہ کے ساتھ شرک" ہی نقل ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔ "وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ" میں "دین" سے مراد طاعت و عبادت ہے، یعنی اللہ نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے اور جن سے روکا ہے، ان سب میں اس کی طاعت اور اسی کی عبادت ہو، کلام عرب میں بھی یہ لفظ طاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تفسیر میں روایت ہے کہ "یہاں تک کہ اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کی جائے، یعنی سب لوگ کلمہ توحید کو مان لیں، اسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی اور اسی کی طرف لوگوں کو بلایا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ کلمہ توحید کا اقرار کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، جب وہ لوگ یہ سب امور کرنے لگیں پھر ان کا خون اور ان کا مال مجھ سے محفوظ ہے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ قتادہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

"وَإِنْ أَنْتُمْ هُمْ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ" یعنی جو کفار آپ سے جنگ کرتے تھے اگر وہ اپنی جنگ بازی سے باز آجائیں اور تمہارے دین کو قبول کر لیں، جو امور اللہ نے ان پر فرض کیے ہیں ان پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا ہو جائیں اور بتوں کی عبادت چھوڑ دیں تم بھی ان سے قتال و جہاد بند کر دو، کیونکہ ظالموں کے سوا اور کسی پر سختی مناسب نہیں۔ یہ "ظالم" وہی ہیں۔۔۔ جو اپنے حقیقی خالق کی عبادت چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہیں اور اللہ کے ساتھ انہیں شریک ٹھہراتے ہیں۔ آیت میں

”عدوان“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی ظالموں کے سوا اور کسی پر ظلم و تعدی مناسب نہیں، گویا ظالموں پر ظلم جائز ہے؟ مفہوم یہ نہیں ہے، بلکہ چونکہ ان کی طرف سے ظلم تھا، اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جیسا معاملہ وہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں تم بھی انھیں ویسا ہی بدلہ دو، اور اسی کی تعبیر ”عدوان“ سے کی گئی ہے۔ وہ ظالم ہیں، حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، تم بھی اس کا بھرپور بدلہ دو اور ان کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو تم عام حالات میں نہ کرتے۔ یہ بدلہ حقیقتاً ظلم نہیں ہے، لیکن بلا کسی وجہ کے اگر تبادلہ میں اس طرح کا معاملہ کیا جائے تو ظلم ہے۔ بدلہ کے لیے اس طرح کی تعبیر دوسرے مواقع پر بھی استعمال کی گئی ہیں، مثلاً ارشاد ہے کہ ”اللذان سے مذاق کرے گا“ وغیرہ، حالانکہ اللہ حقیقتاً ان سے مذاق نہیں کرے گا، بلکہ چونکہ وہ دنیا میں اللہ کے احکام کا مذاق بناتے ہیں، اس لیے قیامت کے دن اللہ نے اپنے بدلہ اور کفار کو اس عمل کی سزا کے لیے یہ تعبیر اختیار کی۔ ہم نے آیت کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کی تائید قتادہ، ربیع اور عکرمہ رحمہم اللہ کے اقوال سے ہوتی ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ“ کا مفہوم یہ ہے کہ ”پس صرف انھیں سے جنگ کی جائے جو جنگ کریں“ مجاہد اور سدی رحمہما اللہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ سدی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ان سے بھی اسی طرح پیش آؤ جس طرح وہ تم سے پیش آتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز، ظلم کو پسند نہیں کرتے، وہ ظالموں ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ بصرہ کے بعض اہل عربیت نے ”فَإِنْ اِنْتَهَوْا“ کے متعلق کہا ہے کہ یہ اہل میں ”فَإِنْ اِنْتَهَى بَعْضُهُمْ“ تھا، یعنی اگر ان میں سے بعض باز آجائیں تو اب تمہاری لڑائی صرف ظالموں سے رہے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ ”اِنْتَهَوْا“ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ہی باز آئیں گے لیکن بعض اہل بصرہ اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بڑا معاف کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے، اور سختی صرف انھیں لوگوں پر مناسب ہے جو ظالم ہیں اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے“

## ایک قابل مطالعہ کتاب الآلات جدیدہ

انرا مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ اس کتاب میں نئی ایجادات مثلاً لاؤڈ اسپیکر، گراموفون، ریڈیو، فوٹو گرافی، انجکشن اور اس کے علاوہ بہت سے آلات جدیدہ کے استعمال اور ان کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذان اور نماز جائز ہے یا نہیں؟ ریڈیو پر قرآن مجید کی تلاوت تفسیر یا دوسری دینی باتیں بیان کرنے کا کیا حکم ہے۔ گراموفون کی شرعی حیثیت، ٹیلی فون، ریڈیو کی خبر کا حکم۔ ان پر اگر کسی نے آیت سجدہ کی تلاوت کی تو کیا سینے والوں پر سجدہ واجب ہو جائے گا؟ سینما اور فوٹو گرافی کا حکم، انجکشن کے احکام، کیا انجکشن سے روزہ فارغ ہو جاتا ہے؟ یہ اور اس کے علاوہ ”آلات جدیدہ“ سے متعلق اور بہت سے احکام دلائل عقلی و نقلی کے ساتھ پوری تفصیل سے آپ کو اس کتاب میں ملیں گے۔ یہ کتاب ہر خاص و عام کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے اور سب کے لیے بہترین رہ نما ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے

ملنے کا پتہ:- ”قیمت الحکمت“ دیوبند (دیوبند)



# نادر کتابیں

## نقشِ حیات

خوش نصیحت سوانح حضرت شیخ الاسلام

جس کے پہلے حصہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان، ابتدائی زندگی، تعلیم، دارالعلوم دیوبند میں داخلہ اور شیخ الہند سے قلبی تعلق اور مسلمانان ہند اور اکابر علماء ہند کا انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کی مکمل تفصیل۔

کتاب کا دوسرا حصہ وہ پیش بہا مجموعہ ہے جس میں اسلامی ریاستوں پر دول یورپ کی مسلسل یورشوں، استخلاصِ وطن کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ، حضرت سید احمد شہیدؒ کا جہادِ حریت، ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ میں علماء و مشائخ کا حصہ، ریشمی خطوط کی انقلابی تحریک، اس کے رفقاء کار، ہندو افغانستان میں اس کے اثرات و نتائج، اسارتِ مالٹا، مقدمہ کراچی وغیرہ کی ایک مستند تاریخ بلے گی۔ قیمت جلد اول مجلد چھ روپے بلا جلد پانچ روپے۔ قیمت جلد دوم مجلد چار روپے آٹھ آنے۔ بلا جلد تین روپے آٹھ آنے۔

## مکتوبات شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے فقہی، سیاسی اور اقتصادی و روحانی مسائل اور پچاس سالہ تاریخ کے منتشر جواب پر پارے، ملکی خیالات، افکار و مسائل کا عظیم الشان مجموعہ جو اس قدر دل چسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کرنے سے پہلے آپ کو چین نہیں آئے گا اور مطالعہ کے ساتھ آپ کا دامن طلب بھی علمی جواب پر پاروں سے مالا مال ہوتا رہے گا۔ کاغذ اعلیٰ قسم، کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ان خوبیوں کے باوجود قیمت مناسب۔

جلد اول مجلد سات روپے	بلا جلد چھ روپے	جلد دوم مجلد سات روپے	بلا جلد چھ روپے
جلد سوم ۱۱ پانچ روپے آٹھ آنے	۱۱ چار روپے آٹھ آنے	جلد چہارم	زیر طبع

ملنے کا پتہ: بیت الحکمت دیوبند

## الشہاب الثاقب

اہل بدعت کے اعتراضات کا جواب، اکابرین دیوبند کی عبارتوں کی صحیح توضیح، حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

## ارشادات شیخ الاسلام

قطب العالم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ کے گرانقدر مضامین، خطبات اور تقریروں کا قابل قدر مجموعہ۔ روحانیت، سیرت مبارکہ، اصلاح معاشرت، مسلمانوں کی ملی اور اجتماعی ضرورتوں کے متعلق بصیرت افروز، روح پرور، بلند پایہ، پر مغز علمی مضامین کا عجیب و غریب گلدستہ جس میں ذکر، احسان و تصوف، استغفار، رموز اور لطائف حج و زیارت، جمال مومن یا اسلامی یونی فارم، دعوت عزم و عمل، جلسہ ہائے سیرت کا مقصد، اسلام اور فلسفہ حج، سیرت پاک کا ازدواجی پہلو، معراج جسمانی اور سائنس و فلسفہ، تعلیم دین، تلاوت قرآن مجید اور ترجمہ قرآن مجید کی اہمیت، کردار مسلم اور روح جمہوریت، جمعیتہ علماء ہند کے کارنامے اور نصب العین وغیرہ رسائل یک جا جمع کر دیئے گئے ہیں حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کا بہترین ذخیرہ ہے۔ قیمت مجدد تین روپے پچاس پیسے۔ بلا جلد تین روپے۔

## ایمان و عمل

یہ رسالہ مودودی صاحب کے اس نظریہ کی تغلیط میں تحریر فرمایا کہ فرائض کا ترک کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا مدنی رح نے اس رسالہ میں مستند روایات سے ثابت کیا ہے کہ فرائض کا تارک اور گناہ کبیرہ کا مرتکب گنہگار ضرور ہوتا ہے مگر دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ مع اعتراضات و جوابات مفصل تحریر۔ قیمت ایک روپیہ۔

## تلخیص الاسلام کامل<sup>۳</sup>

از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرتب دینی نصاب و مابن ناظم جمعیتہ علماء ہند۔ اس کے مطالعہ سے آپ اور آپ کے عزیز اپنے پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی و مدنی زندگی اور صحیح اسلامی واقعات کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک و پاکیزہ اخلاق و عادات اور اسلامی تہذیب سے روشناس ہو سکیں گے۔ قیمت صرف دو روپے چھ آنے۔

پتہ کا پتہ: "بیتِ حکمت" دیوبند

# فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل مرتب

فقہی ترتیب والا جدید ایڈیشن!

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ دور کا عظیم شاہکار اپیدائش سے لیکر موت تک کے مسائل پر

حاوی بینظیر مجموعہ، ڈھائی ہزار سے زائد ایسے مسائل جو عموماً مفصل اور عبارات فقہیہ کے ساتھ مدلل ہیں

مُرتب۔ حضرت مولانا محمد اکمل صاحب سابق رفیق دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند عالم اسلام کا وہ عظیم نشان اور سب سے بڑا مرکز ہے جس کی شہرت اور عظمت دنیا کے ہر ملک میں پھیلی ہوئی ہے جو محتاج تعارف نہیں، اسی طرح اس کے قائلے کو جو مقبولیت اور اعتماد تمام حق تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے وہ کسی مسلمان پر مخفی نہیں۔ ہندو، بیرون ہند، عوام و خواص، پنجپاتوں اور عدالتوں میں دیوبند ہی کا فتویٰ اپنی شان مرکزیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن مانا جاتا ہے۔ الحمد للہ اکابر علماء کی یہ محنت شاقہ عامۃ المسلمین کے فائدے کے لئے کتابی شکل میں "فتاویٰ دارالعلوم" کے نام سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اب صرف پہلی مرتبہ یہ کتاب اپنی شایان شان اور ظاہری و باطنی خصوصیات نیز پورے حقوق کی ادائیگی کے شائع ہو گئی ہے، اس مختصر اعلان میں تمام خصوصیات نہیں آ سکتیں اس لئے چند اہم خصوصیات تحریر ہیں: ملاحظہ فرمائیے (۱) اس قائلے میں دو سلسلے ہیں ایک کا نام "عزیز الفتاویٰ" جو مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب کے تحریر کردہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے، دوسرا "امداد المفتین" جو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ (۲) اس جدید ایڈیشن کی فقہی ترتیب کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے تاکہ کسی بھی مسئلہ کے نکالنے میں کوئی دقت یا دشواری نہ ہو، اور آسانی مطلوبہ مسئلہ تک آئے (۳) لاؤڈ اسپیکر (آڈیو کاسٹ) سے متعلق مسئلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی دارالعلوم نے حال ہی میں علمائے دیوبند و دیگر علماء اہمیت کی تحقیق و آراء کے ساتھ تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کو اس ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے۔ (۴) اس میں عموماً ایسے فتوے ہیں جو مفصل اور عبارات فقہیہ کے ساتھ مدلل ہیں تاکہ علماء و طلباء اور اہل فتویٰ کے لئے بھی مفید ہوں۔ (۵) فتاویٰ دارالعلوم کی پہلی جلد میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے فتاویٰ کی مختصر تاریخ درج ہے۔ (۶) فتاویٰ کی ہر جلد کے شروع میں فہرست مضامین بھی لگائی گئی ہے، جس سے مسائل کا نیکالنا اور بھی سہل ہو گیا ہے (۷) کتاب فتاویٰ کی اہمیت کے باعث اس کی مکرر صحت لائی گئی ہے اور صحت ثانی استاد الاساتذہ حضرت مولانا سید حسن صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سے کرائی گئی ہے (۸) کتابت، طباعت اور کاغذ سب معیاری ہے۔ ٹیبل خوشنما، دیدہ زیب جس میں دارالافتاء دارالعلوم کا فوٹو بھی شامل ہے۔ غرضیکہ اس ایڈیشن میں ضروری اضافوں حواشیوں اور صحت میں بہت زیادہ اہتمام کے باعث اس کی افادیت و خصوصیات میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ اب بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ فتاویٰ دارالعلوم فقہی معلومات کا عمدہ اور مستند ذخیرہ ہے۔ جو طلباء کے لئے شفیق استاد، علمائے دیوبند کے لئے بہترین مشیر اور عوام کے لئے ماہر مفتی کا کام دینے والا ہے۔ الحاصل زندگی کے ہر شعبہ کی تمام ضروریات سے متعلق مسائل کا یہ عظیم ذخیرہ اس قابل ہے کہ تمام مدرسوں، خانقاہوں، لائبریریوں اور ہر مسلم گھر نے میں برائے مطالعہ رکھا جائے۔ ہدیہ مکمل سیٹ ایکسپریس روپے۔

بیٹ الحکمت — دیوبند (یو پی)

# فہرست پارہ غیر ممبران کو بھی رعایتی قیمت پر پیش کیا جائے گا

## تفسیر ممدائیں کا اردو ترجمہ

تفسیر لائیں ایک سے زائد، قرآنیات کی کڑیوں میں سے ایک اہم اور خوبصورت کڑی، یعنی تفسیر ممدائیں کا اردو ترجمہ

① سلف صالحین کے مذاق کے مطابق قرآن فہمی کی مکمل اور جامع کوشش ② احادیث کے فیچے سے قرآن کو حل کرنے کی سعی مشکور ③ اکابر امت کے قطعی فیصلوں کا ایک گراں نایاب ④ لغت ادب کی مصفی چاشنی کا آمیزہ ⑤ فرقہ بانی باطلہ کی غلط شناساوری کا مقابل عقائد صحیحہ کا ساحل مراد ⑥ جا بجا قرآن سے ماخوذ احکام و مسائل، فقہی ژرف نگاہی کے ستہرے نقوش ⑦ صوفیائے ہند کی محبوب تفسیر جو صدیوں ہندوستان کی خانقاہوں میں سہ سہا سہا پڑھائی جاتی رہی ⑧ فقہ حنفی کی کامیاب جہان جس حقیقت کی پُر شکوہ عمارت کو قرآن مضبوط کر دیا ⑨ جا بجا مترجم کے قلم سے وہ حاشیے اضافے، جو قرآنیات کا پچوڑ، ساہا سال کی کاوش، فکر و نظر کے انمول موتی، اور سینکڑوں تفسیر سے منتخب ڈربانے شاہوار ہیں ⑩ عربی کے پُر شوکت اسلوب کو اردو کے جاذب پُرکشش لباس میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ ترجمہ مستقل تفسیر نظر آئے گا۔ انیس عظیم ترین حصے صیبا کی بنا پر اس کا اردو ترجمہ قرآنیات کے ماہر دارالعلوم میں تفسیر کے کامیاب استاذ، اور تراجم و تفسیر کے شہرہ آفاق مصنف حضرت مولانا سید محمد انصاری شاہ صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند ابن حضرت العلامہ مولانا سید محمد انصاری شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔

### آپ کے تعاون کی ضرورت ہے

یہ کہ آپ اس اہم دینی خدمت کے لئے صرف ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کر کے ممبر بن جائیے ممبران کی خدمت میں ہر ماہ تفسیر ممدائیں اس کا ایک پارہ بذریعہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔ ایک پارہ کا عام ہدیہ دو روپے ہوگا، لیکن ممبران کو سو روپے (بشمول) میں دیا جائے گا۔ ہر پارہ پر ڈاک خرچ ۸۵ نئے پیسے آئے گا۔ لیکن اگر پانچ یا اس سے زیادہ حضرات ایک ساتھ ملکر وی پی منگائیں گے تو اوسطاً ہر پارہ پر ڈاک خرچ صرف آٹھ روپے آئے گا۔ ایک پارہ کی ضخامت اوسطاً سو صفحات ہوگی۔ سائز ۳۰x۳۰ کاغذ گندہ گلین، کتابت و طباعت عمدہ اور روشن۔ آج ہی خود ممبر بن جائیے اور دوسروں کو بھی ممبر بنائیے، مزید تفصیلات کے لئے اس پتہ پر لکھیے

## خضر اہ ہٹ ڈپو۔ دیوبند۔ دیوبند

پاکستانی خریدار حضرات | حسب ذیل پتہ پر ایک روپیہ فیس ممبری اور دو روپے قیمت پارہ مع ڈاک خرچ روانہ کر کے رسید (ڈاک خانہ) ہمارے پتہ پر بھیج دیں، پارہ ان کے نام روانہ کر دیا جائے گا۔ اور ممبر بننے کے بعد آئندہ صرف دو روپے بھیج کر پارہ منگاتے رہیں گے۔

پاکستانی پتہ: — مولانا محمد صاحب النوری تعلیم القرآن سنت پورہ لائل پور (مغربی پاکستان)

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مَبَارَكًا

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے، خیر و برکت والی ہے

# تفسیر ابن جریر الرمزی

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظہور الباق اعظمی

ناشر

دلیوبند (یوپی)  
بیت الحکمت